جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ ... روپے

قیمت فی پرچہ پچاس نئے پیسے

جلد (۵۰) | بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء | شمارہ (۱)

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ "جامعہ"، جامعہ نگر، نئی دہلی

ایک اور ستارہ ٹوٹا — حامد صاحب کی وفات

عبداللطیف اعظمی

جامعہ کے آسمانِ تعلیم و ادب کا ایک اور ستارہ ٹوٹ گیا، یعنی جناب حامد علی خاں صاحب کا ۵ر دسمبر کو پیرس میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

موصوف جامعہ کے ابتدائی دور کے گریجویٹ اور اس کے حیاتی رکن تھے تعلیم کے بعد شروع سے جامعہ سے وابستہ رہے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت، ان تھک محنت اور بے لوث خدمت کے ذریعہ اردو کی تصنیفی اور اشاعتی دنیا میں انقلاب پیدا کیا، مکتبہ جامعہ غالباً اردو کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جس نے محض اپنی کتابوں کی آمدنی پر اتنی ترقی کی کہ اردو کے ممتاز ترین اداروں میں سمجھا جانے لگا اور پہلا ادارہ ہے جس نے ہر لحاظ سے —— خواہ کتابوں کی ظاہری شکل و صورت ہو یا زبان، اسلوب بیان اور معیار کا معاملہ ہو —— اردو ادب کو جدید طرز اور نئے انداز سے آشنا کیا اور بچوں کے ادب کو، جس کی طرف نئے تقاضوں کے مطابق بالکل توجہ نہیں کی گئی تھی، قابلِ لحاظ ترقی دی۔ مکتبہ جامعہ کے یہ کارنامے تمام تر رہینِ منت ہیں جناب حامد علی خاں صاحب کی مساعی اور صلاحیتوں کے

حامد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور مئی ۱۹۲۷ء میں جامعہ میں کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء میں تاحیات یا کم سے کم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ مکتبہ جامعہ کی ترقی کا سہرا حامد صاحب کے سر ہے۔ آزادیٔ وطن سے قبل جامعہ کے تمام شعبوں میں انتہائی تنگی ترشی سے زندگی گزرتی تھی، مکتبہ کی زندگی بھی نامساعد حالات اور کٹھن مشکلات سے بھری ہوئی تھی، مگر حامد صاحب کبھی دل شکستہ نہیں ہوتے اور اپنے ساتھیوں کے سہارے اردو زبان و ادب کی خدمت میں برابر لگے رہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ملک میں نافذ ہو گیا۔

جن ملکوں میں بھی جمہوریت کا راج ہے، یعنی کل بالغ شہری آزادی سے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کر سکتے ہیں اور یہ نمائندے مل جل کر جیسی اور جتنی سیاسی پارٹیاں چاہیں بنا سکتے ہیں ان سب کے آئین بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ ان سب میں انصاف، آزادی، برادری اور برابری کے بنیادی تصور پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں کسی نہ کسی حد تک اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے اس لئے کہ جب یہ بنیادی تصور تفصیل کے ساتھ آئین کی دفعات میں ظاہر کئے گئے تو ہر ملک کو اپنے مخصوص خیالات اور روایات کا لحاظ رکھنا پڑا اور اس کی وجہ سے ایک ملک اور دوسرے ملک کے آئین میں تھوڑا بہت فرق پیدا ہو گیا۔ ہم پہلے آئین کے اس عام ڈھانچے کا ذکر کریں گے جو ہمارے دیس میں بھی قریب قریب ویسا ہی ہے جیسا اور جمہوری ملکوں میں۔ پھر اپنے آئین کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کریں گے جس نے اس پرانے ڈھانچے میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس طرح زمانے کے متضاد رجحانوں میں مصالحت، زندگی کے ان ملے سُروں میں میل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے آئین نے بھی ہر جمہوری ملک کے آئین کی طرح اپنے شہریوں کے لئے بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جتنے لوگ اس بھارت دیس میں بستے ہیں چاہے وہ کسی مذہب کسی نسل، کسی خطے کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ قانون کی نظر میں برابر سمجھے جائیں گے ان میں سے کسی کے ساتھ اچھوت کا سا برتاؤ کرنا قابل سزا جرم ہوگا۔ ہر شخص کو آزادی سے اپنے خیالات تحریر اور تقریر کے ذریعہ ظاہر کرنے، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے، ملک میں ہر جگہ آنے جانے رہنے سہنے ملنے جلنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس کی جان کی اور شخصی آزادی کی حفاظت کی جائے گی۔ کسی کو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہر فرد اور ہر جماعت کو پوری آزادی ہوگی کہ اپنے مذہب پر عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ اپنی تہذیب کو قائم رکھے اور فروغ دے، اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسے کھولے اور ان میں اپنا بنایا ہوا یا اپنی پسند کا نصاب پڑھائے۔

ایک شخص کو اپنی جائز ملک پر قابض رہنے کا حق ہوگا اور اگر کوئی شخص اسے اس حق سے محروم کرے یا اور
کسی طریقے سے اس کی حق تلفی یا اس کے ساتھ بد سلوکی کرے تو وہ قانونی چارہ جوئی کر سکے گا۔

ملک میں اس طرح کا نظم و نسق قائم کرنے کے لئے جس سے امن و امان خوش دلی اور خوش حالی کا
دور دورہ ہو اور لوگ اپنے بنیادی حقوق سے فائدہ اٹھا سکیں ہمارے آئین نے حکومت کو تین شعبوں
میں بانٹا ہے۔ قانون ساز، انتظامی اور عدالتی اور اس کا خیال رکھا ہے کہ تینوں کے کام میں تال میل رہے۔
آئین نے کہا کہ مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستوں کی قانون ساز مجلس میں وہ لوگ منتخب ہو کر آئیں جنھیں اپنے
اپنے حلقے میں زیادہ تر لوگوں کا اعتماد حاصل ہو۔ ان ہی لوگوں کی غالب رائے سے قانون بنائے جائیں
جو قانون کے مطابق ملک کا انتظام کریں یہ وزیر اس وقت تک اپنے عہدوں پر رہیں جب تک انھیں
قانون ساز مجلسوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ جب وہ یہ اعتماد کھو دیں تو انھیں ہٹا کر دوسرے
وزیر بنائے جائیں۔ اس طرح انتظامی شعبہ جو عام طور پر گورنمنٹ یا سرکار کہلاتا ہے آئین ساز شعبے
یعنی لوگوں کے چنے ہوئے نمائندوں کے ماتحت رکھا گیا ہے اور اسے ان کی مرضی کے مطابق کام کرنا
پڑتا ہے۔ تیسرے شعبے یعنی عدالت کو ہمارے آئین نے اپنے فرائض کے ادا کرنے کی پوری آزادی دے
رکھی ہے۔ وزیروں کو یا قانون ساز مجلسوں کو ان کی کارروائیوں یا فیصلوں میں دخل دینے کا کوئی حق
نہیں۔ عام طور پر عدالتوں کا کام قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینا ہے اور حق داروں کو
ان کا حق دلانا ہے لیکن ریاستوں کے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دیوانی اور فوجداری کے مقدموں
کا اپیل سننے کے علاوہ آئین کی حفاظت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ وہ اس کی نگرانی کرتے ہیں کہ حکومت
کسی شخص کے حقوق کو جو آئین نے اسے دیئے ہیں پامال نہ کرنے پائیں اور قانون ساز مجلس کوئی ایسا
قانون نہ بنانے پائے جو آئین کے خلاف ہو۔ ہندوستان کے سپریم کورٹ کو تو آئین کی حفاظت
کے سلسلے میں اتنے اختیارات حاصل ہیں جو دنیا کے کسی ملک میں بڑی سے بڑی عدالت کو نہیں ہیں۔
اس آئین کی تعبیر اور تفسیر کے سلسلے میں اس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہے اور وہ ان سب جھگڑوں
کو چکاتا ہے جو مرکزی حکومت اور کسی ریاست کے درمیان یا ریاستوں میں آپس میں اختیارات کے

بارے میں ہوتے ہیں۔

غرض ہمارے آئین میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے تینوں شعبے ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کریں، اور ان کے اختیارات میں توازن قائم رہے تاکہ ان بدعنوانیوں کی روک تھام ہو سکے جو انسانی فطرت کی کمزوری سے سیاست اور حکومت میں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ یہ تو وہ چیزیں ہوئیں جو تھوڑے بہت فرق سے ہر جمہوری ملک کے آئین میں موجود ہیں۔ اب ہم ہندوستان کے آئین کی اس خصوصیت کی طرف آتے ہیں جسے ہم نے اس کی روح کہا ہے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ جس نے عام انسانیت کو دو مخالف فریقوں میں بانٹ کر دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے یہ ہے کہ جب جمہوریت کے تین بنیادی اصولوں، انصاف، برابری اور آزادی میں ٹکر ہو تو ان میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے مغربی ملکوں کی سو سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن ملکوں میں فرد کی آزادی پر زیادہ توجہ ہوئی ان میں انصاف اور برابری قائم رکھنا خصوصاً معاشی زندگی میں مشکل گیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد فرد کی آزادی کے سائے میں سرمایہ داری روک ٹوک دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور شروع شروع میں اس نے زیادہ سے زیادہ نفع کی ہوس میں محنت کش طبقے کو خوب دبایا نچوڑا اور چوسا، اس کے رد عمل کے طور پر کچھ ملکوں میں اشتراکی انقلاب ہوا اور محنت کشوں کے ساتھ انصاف کرنے غریب امیر کے فرق کو مٹانے یا کم کرنے کی دھن میں صنعت اور تجارت کے شعبوں میں فرد کی آزادی کو اس طرح کچلا گیا کہ وہ زندگی کے سبھی شعبوں میں دب کر اور سمٹ کر رہ گئی۔ آزاد ہندوستان کے آئین میں سماجی اور معاشی زندگی کے ایسے نظام کا تصور ہے کہ فرد کی آزادی کی لچک اور حوصلہ مندی قائم رہے لیکن اسے اس کی چھوٹ نہ ہو کہ اپنے فائدے کی خاطر سماج کو نقصان پہنچائے اور اپنے سرمائے کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے محنت کش طبقے کو کم سے کم اجرت اور حقوق دے ہمارا آئین ایسی سماج بنانا چاہتا ہے جس میں دولت طاقت تعلیم تہذیب سمٹ کر چند آدمیوں کے ہاتھ میں نہ چلی جائے بلکہ دیس کی پوری آبادی میں ہر ایک شخص کو اپنی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق ان کی زندگی کی ان نعمتوں میں حصہ ملے۔ یہی اس کی خصوصیت ہے اور یہی اس کی روح ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ہمارے آئین کی سیکولر نوعیت

پروفیسر غلام السیدین

جب ہندوستان نے آزادی حاصل کی تو ایک مشکل حل ہوگئی لیکن بہت سی اور مشکلوں اور مسئلوں کے دروازے کھل گئے۔ آزادی آتی ہے تو وہ ہمیشہ بہت سے کٹھن مسئلے لے کر آتی ہے۔ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے کانٹوں کا تاج ہے! ان میں ایک بہت اہم اور مقدم مسئلہ یہ تھا کہ ملک کا آئین یا دستور کس قسم کا بنایا جائے۔ مثلاً وہ جمہوری ہو یا کسی اور نمونے کا؟ آئین میں مرکز کے کیا اختیارات ہوں اور صوبوں یا ریاستوں کے کیا؟ جن اختیارات کی تفصیل صراحت کے ساتھ آئین میں نہ ہو، مرکز کے ماتحت سمجھے جائیں یا صوبوں کے؟ صوبوں کی تقسیم زبان کے اعتبار سے ہو یا دوسرے جغرافیائی اور انتظامی امور کے لحاظ سے؟ قانون ساز جماعتوں کی نوعیت کیا ہوگی اور ان کا انتظامی حکومت سے کیا رشتہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے علاوہ ایک بنیادی مسئلہ اور تھا جس کو دستور سازی کی پہلی ہی منزل میں طے کرنا تھا یعنی آئین کو مذہبی بنیاد پر بنایا جائے یا سیکولر یعنی غیر مذہبی بنیاد پر۔ دنیا کی تاریخ میں دونوں قسم کے دستور بنائے گئے ہیں اور گو موجودہ زمانے کا عام رجحان سیکولر ہی ہے لیکن ہر ملک کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے حالات، ضرورتوں اور تقاضوں کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرلے۔ آزادی سے پہلے بھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا اور ملک کے دوربین حضرات اور مختلف جماعتوں نے اس پر کافی غور کیا تھا اور اپنی رائے ظاہر کی تھی اور جب دستور ساز اسمبلی کے سامنے یہ سوال پیش ہوا تو کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارا آئین جمہوری ہو، غیر مذہبی ہو، اس میں سماجی انصاف کے اصولوں کی کارفرمائی ہو اور اس کا نمایاں رجحان سوشلزم کی طرف ہو۔ یہ تو کہنا غلط ہوگا کہ سب لوگوں نے یہ رضا و رغبت ان اصولوں کو قبول کرلیا یا وہ سب جو ان کے موافق تھے انھوں نے ان کو

پوری طرح سمجھا بھی لیکن یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہمارے بہترین سیاسی مفکر اور مدبر اور عوام بھی جہاں وہ سمجھ سکے
تھے ایک ایسا آئین چاہتے تھے جس میں ذات پات، نسل، رنگ، مذہب، دولت کے اعتبار سے کوئی لگاؤ
اور بدمزہ بھید بھاؤ نہ ہو۔ اور ہندوستان کے سب باشندوں کو امن اور آزادی کے ساتھ دیس کے ترنگے
جھنڈے کے نیچے ایک شریف اور معقول زندگی بسر کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ اور
اس کی جو مخالفت تھی وہ زیادہ تر مفاد مخصوص کی طرف سے تھی یعنی بعض ایسی جماعتوں اور گروہوں
کی طرف سے جو چاہتے تھے کہ نئے دور میں بھی اپنے مخصوص اور ناجائز حقوق اور رعایتوں کو برقرار
رکھیں اور ان میں دوسروں کو شریک نہ کریں بلکہ ہو سکے تو نئے آئین کی تشکیل اس طرح کریں کہ اس کے
اندر وہ اپنے لئے خاص مراعات حاصل کر سکیں۔ خود غرضی اور سماجی فلاح، بے انصافی اور انصاف پسندی،
بے جا امتیاز اور مساوات کی یہ جنگ مدتوں سے جاری ہے اور جاری رہے گی لیکن یہ بات کسی قدر
اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے آئین نے بحیثیت مجموعی انصاف اور مساوات کا ساتھ
دیا ہے اور ان کا علم بلند رکھا ہے۔ یہ پوری جیت نہیں۔ کیونکہ افراد اور جماعتوں کا عمل اور روزمرہ
کی زندگی آئین اور دستور کو حرفِ غلط بنا سکتی ہے لیکن جیت کی پہلی منزل ضرور ہے۔

اس وقت مجھے اس آئین کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرنا نہیں ہے۔ صرف ایک
پہلو کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ ہے اس کی سیکولر نوعیت یعنی اس اصول کا
احترام کہ اس میں کسی خاص گروہ یا فرقے کو مذہب کی بنا پر کوئی ترجیح یا فوقیت یا مخصوص حقوق
حاصل نہ ہوں گے سوا ان کے جو آئین کی رو سے ہر شہری کو مساوی طور پر حاصل ہوں۔ ہر مذہب و ملت کے
لوگوں کو آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، اپنے طریقے سے عبادت اور پوجا پاٹ
کریں، اپنے خیالات دوسرے کے سامنے معقولیت اور رواداری کے ساتھ پیش کریں بشرطیکہ اس
حق کے استعمال سے دوسروں کی کوئی واقعی دل آزاری نہ ہو اور ان کی آزادی پر چھاپا نہ مارا جائے۔ اس
نکتہ کو پوری طرح واضح کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس لفظ سیکولر یا غیر مذہبی سے بڑی غلط فہمیاں پیدا
ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں اور اس کے حامیوں اور مخالفوں نے بعض دفعہ اس کی غلط تفسیر کی ہے اور

تجربہ کے طور پر اس کے موافق اور مخالف جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں وہ بھی غلط ہیں۔ آیئے ان میں سے ایک دو پر نظر ڈالیں، تفریحاً یا ایک دماغی شغل کے طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ اگر ہم نے اپنے آئین کے اس بنیادی ستون کی اہمیت کو نہیں پہچانا اور اسے مستحکم نہیں کیا تو ہماری قومی زندگی کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ بعض لوگ غیر مذہبی آئین کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بے دین یا مخالف مذہب آئین ہے جو مذہب یا مذہبی تعلیم یا مذہبی تقاضوں کو ملک میں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں، یہ ایک فاش غلطی ہے۔ علاوہ اور وجہوں کے یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارے دیس کا آئین، جس کے نمایاں معماروں میں ایسے مذہبی لوگ شامل تھے جیسے مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن مذہب کے خلاف ہوں۔ ان لوگوں کے اندر تو مذہب کی روح رچی ہوئی تھی۔ ان کا عقیدہ تو قرآن شریف کے الفاظ میں گویا یہ تھا کہ ہمارا مرنا اور جینا، ہماری عبادت اور پوجا پاٹ سب اس ایشور یا اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا بنانے والا ہے۔ وہ دل سے ایک بات کو مانتے تھے کہ ایک اچھی زندگی اور ایک نیک انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ مذہب کی سچی روح اور ان قدروں سے وابستگی پیدا کرے جو اس نے دنیا کو سکھائی ہیں۔ ٹیگور کی وشو بھارتی یونیورسٹی کا ایکٹ پارلیمنٹ میں پیش تھا اس کی ایک ایک دفعہ پر قانونی نقطۂ نظر سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اس میں ایشور کا لفظ نہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس موقع کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا آزاد نے اپنی ایک تقریر میں زور دیکر کہا تھا کہ ممکن ہے قانون کی مدوں میں ایشور کا نام آئے لیکن مجھے اس بات میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ اس یونیورسٹی کی زندگی میں اس کا ایک مقام ہے اور بہت بلند مقام ہے میں پورے زور اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ گرودیو نے جس طرح اس یونیورسٹی کے مقاصد کی تعریف کی ہے جس میں یہ جملہ بھی شامل ہے، وہ ہمیشہ اس یونیورسٹی کے طلبا اور استادوں کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ گرودیو نے شانتم، شِوَم، ادوائتم کی جو تین اصطلاحیں استعمال کی ہیں ان میں خدا کا ایک ایسا تصور مضمر ہے جو نسل مذہب اور عقیدے کی تنگ بندشوں سے بلند ہے، لہٰذا ایک غیر مذہبی ریاست کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اس میں مذہب کی کوئی جگہ نہیں۔ پھر اس کا کیا مقصد ہے؟

مثلاً اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے نہ بیجا بندشیں اور پابندیاں ہوں، نہ بیجا مراعات اور پاسداری۔ اس بات کے لئے ہندوستان کے آئین ساز تیار نہ تھے۔ اگر ہندوستان کا آئین مذہبی بنیاد پر بنایا جاتا تو اس ملک میں ہندو راج قائم ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہاں انھیں کی بڑی اکثریت ہے، لیکن اس قسم کے آئین میں ایک بڑا اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں دوسرے مذہبوں کے لوگ ایک طرح سے دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری ہو کر رہ جائیں لیکن ملک کی رواداری کی قدیم روایت اور جمہوریت کے نئے تقاضوں نے اس خیال کا سواگت نہیں کیا۔ گاندھی جی جب ہندوستان میں "رام راج" کا خواب دیکھتے یا اس کا پرچار کرتے تھے تو وہ کسی خاص مذہبی جماعت یا مذہبی تصور کا راج نہ تھا بلکہ ملک میں انصاف و شرافت کا راج تھا۔ لہٰذا ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ملک میں جہاں کئی مذہبوں کے ماننے والے ساتھ ساتھ رہتے ہوں اور ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا لازم ہو، ایک غیر مذہبی ریاست کا تصور بھی سچی مذہبیت کا اظہار ہے! مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف میں لکھا ہے کہ "اگر تم کسی قوم سے دشمنی کے سبب بھی بے انصافی کرو گے تو تم خدا کی نگاہ میں مجرم ہو۔ لہٰذا دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو۔" جب ایک سیاسی دشمن کے ساتھ بھی بے انصافی کرنا گناہ ہے جس سے ممکن ہے تمہاری جنگ ہو رہی ہو۔ تو یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قوم کے بعض افراد کے ساتھ جن کا اٹھنا بیٹھنا، جینا مرنا سب مشترک ہے، انصاف اور مساوات کا سلوک کیا جائے اور جمہوری سائٹی کے دستور کی بنیاد کسی مذہبی تصور پر رکھی جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایکتا کی بڑی ضرورت ہے اور میں جانتا ہوں کہ میں نے یہ کوئی نئی بات نہیں کہی۔ نئی نہ سہی لیکن یہ بات کہنے کی ہے، اس وقت تک جب اس کا دہرانا غیر ضروری ہو جائے۔ اس ایکتا میں سچائی اور مضبوطی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں لوگوں کے جائز اختلافات کے لئے گنجائش ہو اور رواداری کی فضا میں ان کا احترام کیا جائے، جب مختلف رنگ، نسل اور مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ امن و آشتی اور محبت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس سماج کے لئے ایک غیر مذہبی ریاست کا تصور ایک جمہوری کام دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ سب اسے خلوص کے ساتھ قبول کر لیں اور اس کی پابندی کریں اور اس ذہنیت کو اجاگر کرنے کے لئے ایک سچا سیکولر نظام مفید ہو سکتا ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

چند منتخب شعر

حضرت روش صدیقی

(حضرت روش صدیقی پروفیسر محمد مجیب صاحب سے ملنے جامعہ تشریف لائے تھے۔ جہاں روش صاحب موجود ہوں وہاں یہ ناممکن ہے کہ شعر و شاعری کی محفل گرم نہ ہو۔ موصوف نے مختلف غزلوں کے متفرق شعر سنائے، چند شعر جامعہ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہیں)

درِ دل اگر نہ کھلتا تو سکون کہیں نہ ملتا
کوئی ہم زباں نہ ہوتا کوئی ہم نشیں نہ ملتا
تو حرم میں اس کا دامن جو نہ بڑھ کے تھام لیتا
تو روش وہ شوخ تنہا تجھے پھر کہیں نہ ملتا

ہنس بول لیا کوئی تو ہیں بندۂ بے دام
آزاد ہیں ہم لوگ گرفتار ہیں ہم لوگ
اس انجمن ناز میں کیا کام ہمارا
تہمت زدۂ شوخی گفتار ہیں ہم لوگ
ہے چیں بہ جبیں وقت کہ ہم کوہ گراں ہیں
سمجھا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار ہیں ہم لوگ

حضرت تسکین قریشی

جب تری رہگذر سے گذرے ہیں
ہم تو کچھ بے خبر سے گذرے ہیں

کیا یونہی مل گیا ہے منصب عشق؟
اُن کی اِک اِک نظر سے گذرے ہیں

مے چھٹی اور میکدہ نہ چھُٹا،
جب بھی گذرے اُدھر سے گذرے ہیں

کتنے چہروں سے اُٹھ گئی ہے نقاب
ہم جنوں میں جدھر سے گذرے ہیں

خود انھیں بھی خبر نہیں جن کی
وہ بھی جلوے نظر سے گذرے ہیں

ٹھوکریں کھائی ہیں وہیں تسکین
ہم سنبھل کر جدھر سے گذرے ہیں

۱۸۵۷ء کے قبل کی چند مطبوعہ منظوم داستانیں

کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں

جناب نصیر الدین ہاشمی

کتب خانہ سالار جنگ نوادرات کا ایک خزانہ ہے جہاں نہ صرف قلمی بلکہ مطبوعہ کتابیں بھی نایاب
لیاب موجود ہیں منظوم قلمی داستانوں سے قطع نظر مطبوعہ منظوم داستانوں کی تعداد ۱۶۹ ہے۔ ان
سے انیس[19] داستانوں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے[۱]

۱) **قصے بادشاہ روم**:۔ اس کے مصنف کا نہ کوئی نام درج ہے اور نہ مثنوی میں شاعر نے اپنا
ص ظاہر کیا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں جو قلمی داستانیں ہیں ان
کوئی قلمی داستان اس مضمون کی نہیں ہے۔ ایک قلمی داستان اس نام کی ضرور ملتی ہے مگر اس کا قصہ بالکل
لگانہ ہے اس لئے یہ مطبوعہ داستان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس داستان کی تصنیف کس سنہ میں
ئی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ داستان سنہ ۱۲۷۱ھ (سنہ ۱۸۵۵ء) میں مطبع حیدری میں نور الدین
جیوا خاں کی کمپنی نے بمبئی میں طبع کیا ہے۔ مثنوی میں اولاً بیس اشعار ہیں۔ حمد و نعت ہے اور داستان
۳۲ شعر کی ہے۔ مثنوی کے آغاز اور داستان کے آغاز کے اشعار حسب ذیل ہیں:۔

هو کس سے حمد ادا اس خدا کی ۔۔۔ کہ جس نے عرش اور کرسی بنا کی
کیا ہے کو یوں قدرت سے قایم ۔۔۔ رکھا ہے بے ستون افلاک دائم

۱؎ میرا ایک مضمون بمبئی کے ہفتہ وار اخبار "دور حیات" مورخہ ۲۰ اگست ۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے، جس میں
۱۸۱ء کی مطبوعہ نثری داستانوں سے بحث کی گئی ہے۔ (ہاشمی)

خودی کے کام سے بندو ڈرو تم ۔۔۔ یہ شاہ روم کا قصہ سنو تم
عجب اس شاہ کا یہ تذکرہ ہے ۔۔۔ خودی سے اپنے کیا کیا دکھ سہا ہے
اسے سن کر جو ہووے مرد عاقل ۔۔۔ خدا کے خوف سے ہووے نہ غافل

اگر داستان کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے تو مضمون طویل سے طویل تر ہو جائے گا اس لئے صرف لب لباب درج ہے ۔

ملک روم کا ایک بادشاہ تھا اس نے قرآن خوانی میں جب یہ آیت پڑھی کہ خدا جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک وسواس پیدا ہو گیا اور اپنی خودی پر غرور و تکبر کرنے لگا ۔ خدا نے اس کو زندگی میں ہی ایک سبق دینا چاہا ، چنانچہ اس کو شکار کے موقع پر اپنے لشکر اور متعلقین سے علیحدہ کر کے چین کے ملک میں پہنچا دیا گیا ۔ وہاں اس کی زندگی کے بارہ سال گزرے ۔ اس عرصہ میں غلطی سے چوری کے الزام میں ہاتھ کاٹے گئے پھر شہزادی چین کو تعلیم دیتا رہا ۔ قدرت نے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کے بعد اسی شہزادی سے شادی ہوئی ۔ بارہ سال کے بعد پھر خدا نے اس کو اپنے ملک میں پہنچا دیا اور یہاں صرف چند گھنٹے ہوئے تھے اور شاہی لشکر بادشاہ کے انتظار میں بدستور موجود تھا ۔ شاہ روم اپنے غرور و تکبر کے بعد نادم ہوا خدائی کرشمہ دیکھ کر حیران ہو کر توبہ کی ۔

قصہ ختم ہونے کے بعد تکبر اور غرور کی مذمت میں چند شعر لکھے گئے ہیں ۔

خودی سے جو کوئی بھولا خدا کو ۔۔۔ وہ پہنچا پا گیا اپنی سزا کو
خودی سے نوح کا طوفان آیا ۔۔۔ خدا نے جس کی امت کو ڈبو یا
کہاں رہزن کہاں اس شاہ کی ذات ۔۔۔ دکھایا حق نے قدرت کا طلسمات
کسی سے حال آدم اپنا مت کہہ ۔۔۔ خدا کی یاد میں مشغول ہو رہ

غرض اس مثنوی اقصہ میں اخلاقی سبق دیا گیا ہے ۔

(۲) ہشت گلزار ۔ اس مثنوی (داستان) کے مصنف شاہ حسن المتخلص بہ حقیقت ہیں ۔ اس

داستان میں بہرام گور کی داستان کو نظم کیا گیا ہے۔ اس داستان کو ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں محمد مصطفےٰ خاں
ند حاجی محمد روشن خاں نے لکھنؤ میں طبع کیا ہے۔ کسی شاعر اشرف نے طباعت کی حسب ذیل تاریخ
نکالی ہے:

کیا چھپی مثنوی حقیقت کی — کھل گیا جس سے لالہ زار طبع
لکھا اشرف نے مصرع تاریخ — ہشت گلزار ہے بہار طبع
۱۲۶۷

اس مثنوی میں حمد، نعت، مناجات وغیرہ کے بعد عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ ابن
ب والا جاہ مرحوم رئیس ارکاٹ کی مدح بھی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ "حقیقت" نے اس مثنوی کو اپنے
قیام ارکاٹ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے بعد یہ مثنوی لکھنؤ میں طبع ہوئی۔

میں نے "مدراس میں اردو" میں اس مثنوی ہشت گلزار کا تذکرہ کیا ہے اور اس کو محمود بلگرامی
تصنیف قرار دی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "حقیقت" شاہ محمود کے نام سے ہی ملقب ہو۔ دونوں
نوں کے اشعار دیکھنے سے واضح ہوتا ہے ایک ہی مثنوی ہے۔ چونکہ اس وقت محمود بلگرامی کی
ی مثنوی دسترس سے باہر ہے اس لئے اس کے متعلق مزید صراحت سر دست نہیں کی جا سکتی۔

مثنوی (داستان) کا آغاز حمد سے ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

لے فراز ندۂ لوائے وجود — پختگی بخش خامی زر وجود
روز و شب سروران با تمکین — ملکہ سب بادشاہ روئے زمین
جبہ سائیدہ یاں ہیں شام و سحر — لاکھ دارا ہزار اسکندر
دے تو شاہی کا جس کو چاہے سریر — چاہے جب شاہوں کو بنا دے فقیر
یاں جو گردن کشی کرے اور زور — شکل بہرام گور جائے بہ گور

عبدالقادر خان ثابت جنگ کی مدح کے چند شعر پیش ہیں:-

ہے یہاں ایک وہ امیر کبیر — جس کے محتاج ہیں جہاں کے امیر
جود و ہمت میں اور سخاوت میں — زور و قوت میں اور شجاعت میں

صاحب جود و ہمت و بخشش ۔۔۔ والی ملک و نعمت و بخشش

طویل منقبت و مدح کے بعد ہی داستان شروع کر دی گئی ہے ۔ دو شعر یہ ہیں:

کیا بیان کیجیے اس کی شان و شکوہ ۔ شاہوں کا جس کے در پہ ہوا نبوہ

نام بہرام گور تھا اس کا ۔۔۔ کیا کہوں کیسا زور تھا اس کا

یہ مثنوی (۱۳ × ۸ ½) سائز کے ۱۰۸ صفحے پر مشتمل ہے ۔ ہر صفحہ میں دو کالم ہیں اس طرح ۴۸ شعر ہر صفحہ پر لکھے گئے ہیں یعنی پانچ ہزار شعر سے زیادہ کی مثنوی ہے ۔ داستان با تصویر ہے ۴۰ تصاویر ہیں ۔ اس سے واضح ہے کہ کتاب میں تصاویر کو طبع کرنا کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔

(۳) **تحفہ جعفر** :- یہ مثنوی سنہ ۱۲۶۱ھ (سنہ ۱۸۴۹ء) میں لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے ۔ سائز (۴ × ۶) ہے اور ۱۰۴ صفحے پر مشتمل ہے ۔ دراصل یہ ایک داستان نہیں بلکہ چند قصوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے اور اس میں گناہوں کے متعلق عذاب الٰہی کی صراحت ہے ۔

قصوں کے طرز پر چند حکایتیں منظوم کی گئی ہیں ۔ مثنوی میں اولاً حمد و نعت ہے اس کے بعد چودہ آئمہ معصومین کا ذکر ہے ، پھر حضرت علی کا ایک معجزہ مردہ کو زندہ کرنے کا لکھا گیا ہے اس کے بعد چند دوسری حکایتیں ہیں ۔ آغاز یوں ہے :-

دلا کر تو حمد خدائے ودود ۔۔۔ کہ ہے جسم و جاں کا اسی سے وجود

وہی کل عالم کا معبود ہے ۔۔۔ وہی جن و انساں کا مسجود ہے

اس مثنوی کے مصنف مرزا حسن علی المتخلص بہ جعفر ہیں اور مرزا جعفر علی نے اپنے مطبع حیدری میں طبع کرایا ہے ، چنانچہ اختتام کی عبارت حسب ذیل ہے ۔

" ایں مثنوی مسمیٰ بہ تحفہ جعفر من تصنیف والاجناب تقدس مآب مرزا حسن علی صاحب دام ظلہ ، تخلص بہ جعفر در سنہ ۱۲۶۲ھ مرزا جعفر علی صاحب دار الطبع حیدری از سطوزنان جالینوس دوران ہم سید محمد الزماں صاحب نے رکاب گنج جدید طبع کیا ۔

(۴) **یوسف زلیخا** :- اس داستان کے دو مطبوعہ نسخے اس کتب خانہ میں ہیں ایک نسخہ ۱۲۴۳

مطبوعہ ہے اور دوسرا نسخہ سنہ ۱۲۷۲ھ کا مطبوعہ ہے۔ دونوں نسخے بمبئی کے چھپے ہوئے ہیں اول الذکر
کی طباعت کا تذکرہ اس طرح ہوا ہے۔

"حقیر فقیر علی بھائی بن لقمان جی کی کمپنی نے اپنے مطبع حیدری میں سنہ ۱۲۶۴ھ میں
چھپایا۔"

دوسرے نسخہ میں طباعت کے متعلق جو صراحت ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"شہر بمبئی میں حقیر نور الدین بن جیوا خاں نے بشراکت قاضی ابراہیم کے لیے مطبع
حیدری میں چھپایا سنہ ۱۲۷۲ھ مقدس۔"

یوسف زلیخا کی یہ داستان کسی شاعر نگاری کی مصنفہ ہے خاتمہ پر تخلص کی جو صراحت ملتی
ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نگار اب خامشی ہے تجھکو بہتر — بھلا ہے اب یہ قصہ مختصر کر
گئی آنکھوں سے نیند اب ناگہانی — زباں کر بند بس کر یہ کہانی

مثنوی کے آغاز کے اشعار یہ ہیں۔

الٰہی عشق سے اپنے تو کر شاد — مرا دل کر تو اپنا عشق آباد
عناصر کی یہ میری ہے جو ہستی — بسا تو عشق کی اس بیچ بستی
نکال اب راہ اس میں چاک دل سے — بنا دو کان دو دو اس آب و گل سے

داستان کے خاتمے پر تاریخ تصنیف اور تعداد ابیات کی صراحت خود مصنف نے
ظاہر کر دی ہے۔

خطا میراث ہر انساں کا ہے — جو اہل دل ہیں ان کے بھی خطا ہے
ہزار اور دو سو اور دس اور تھے دو — کیا انجام جب یہ داستاں کو
گنے ابیات جو ہیں اس کے اک بار — ہوئے تب تین ہزار اور بست اشعار
لکھا تھا عشق سے جو اس کو نامہ — رکھا تب نام اس کا عشق نامہ

ان اشعار سے واضح ہے کہ مثنوی کا نام عشق نامہ اور اس کی تصنیف سنہ ۱۲۱۳ھ میں ہوئی اور اشعار کی تعداد (۳۰۲۰) ہے۔

یوسف علیہ السلام کا قصہ ایک مشہور قصہ ہے اس لئے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ بمبئی میں دو مرتبہ اس کی طباعت ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گزشتہ صدی میں اس داستان کی خاص اہمیت تھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نگا نے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے یا خود ان کی اپنی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا املا خاص طرز کا ہے۔ مثلاً خاموشی کو "خامشی" لکھا گیا ہے۔

(۵) مثنوی گلزار نسیم :- پنڈت دیا شنکر شاگرد خواجہ حیدر علی آتش کی یہ مثنوی ہے۔ اس کتب خانہ میں سنہ ۱۲۶۰ھ کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے اس میں تاریخ طباعت کے بھی دو قطعہ شامل ہیں۔ ایک قطعہ خود مصنف کا طبع زاد ہے اس کے دو آخری شعر یہ ہیں۔

چوں زیور طبع نیک پوشید | بر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع | گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰ھ

دوسرا قطعہ تاریخ مولوی کرامت علی المتخلص اطہر کا ہے جو حسب ذیل ہے۔

بہر مشتاقان حسن ایں قصہ را فرمود طبع | ہشت چوں از بسکہ با خلق میم آراستہ
طرز طبعش دید اطہر بہر تاریخش نوشت | با کمال طبع گلزار نسیم آراستہ
۱۲۶۰ھ

آخری صفحہ (۸) پر یہ قطعات درج ہیں اس کے بعد فارسی میں طباعت کے متعلق وضاحت کی گئی ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیا شنکر آتش کے شاگرد تھے۔ میر حسن کے مطبع حسینی میں جو محمود نگر متصل اکبری دروازہ لکھنؤ تھا۔ یہ مثنوی طبع ہوئی۔ اور مزید یہ کہ مثنوی گلزار نسیم دراصل نثری قصے "قصہ تاج الملوک و بکاولی" کا منظوم قالب ہے یعنی یہ داستان نسیم کی طبع زاد نہیں بلکہ نثری داستان بکاولی کو انھوں نے صرف نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔

(۶) مثنوی گل و صنوبر :- اس کے بھی دو نسخے اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ مطبع مصطفائی میں سنہ ۱۲۶۱ھ میں طبع ہوا ہے۔ چنانچہ خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"تمام شد مثنوی گل شہزادہ و صنوبر پری بتاریخ پانزدہم شہر رجب سنہ [illegible]
میں در مطبع مصطفائی واقع محلہ محمود نگر بیت السلطنت لکھنؤ باہتمام محمد مصطفیٰ خاں ابن
حاجی محمد روشن خاں مرحوم بہ طبع رسید"

مصنف نے اپنا تخلص درج نہیں کیا۔ آغاز میں حمد و نعت کے بعد بادشاہ کی مدح ہے
لیکن بادشاہ کا نام نہیں ہے چونکہ اس زمانہ میں لکھنؤ کی مسند حکومت پر امجد علی شاہ جلوہ گر تھے۔
بادشاہ کی مدح کا عنوان حسبِ ذیل ہے۔

در مدح حضرت سلطان زمان خلد اللہ ملکہ

اس کے چار شعر ہیں۔ اس کے بعد مدح صاحب عالم کیوان جاہ کا عنوان ہے۔ اس
کے سات شعر ہیں اس کے بعد ہی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔

گل و صنوبر کا دوسرا نسخہ بمبئی کے مطبع محمدی میں سنہ ۱۲۶۸ھ سنہ ۱۸۵۲ء میں طبع
ہوا ہے۔ چنانچہ خاتمہ میں حسبِ ذیل صراحت ہے۔

"تمام شد مثنوی گل شہزادی و صنوبر پری بتاریخ بست و ہفتم شہر ربیع الاول ۱۲۶۸ھ
مقدسہ معلی در معمورہ بمبئی باہتمام محمد حسین صاحب بن منشی محمد مسلم صاحب در مطبع محمدی
حلیہ انطباع پوشید"

آغاز

الٰہی مجھے کردے رنگیں رقم	کہ گل ریز معنی ہو شاخ قلم
کروں حمد کی بوستاں پر نثار	گلستان حکومت کی تازہ بہار

مثنوی میں حمد و نعت منقبت حضرت علی کے بعد صاحب عالم کیوان جاہ مرزا محمد حسن خاں
بہادر کی مدح ہے اور اس کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔

مثنوی کا اختتام

ہوئے شادماں واں کے سب مرد و زن	لگے کہنے کہ تاباں ہوا پھر سہیل یمن

[illegible] وصل کو [illegible] کے مل — بجام طرب با صنوبر شہ گل
[illegible] میں سب کا سبب — بہ عیش و عشرت نیاز و طرب
لکھوا [illegible] شہ داد و دین — کہ سرگرم آمیں سے روح الامین
الٰہی رہے جب [illegible] یہ جہان — سلامت رہے شاہ کشورستان
برآویں سبھی [illegible] کے مدعا — طفیل علی یا مجیب الدعا

داستان کا آغاز

ہوئی نغمہ زن عندلیب قلم — کروں داستان ایک رنگین رقم
یمن میں تھا اک شاہ عالی مقام — فریدون حشم شاہ رعنا بنام
عجب نوجوان اس کے تھا اک پسر — سہی قد پری چہرہ رشک قمر

مثنوی ۱۸ صفحے کی ہے متن میں پندرہ شعر اور حاشیہ پر ۱۴ شعر درج ہیں۔ اس طرح تقریباً (۵۰۰) شعر کی مثنوی ہے۔ مثنوی میں شہزادہ گل اور صنوبر پری کی داستان عشق منظوم کی گئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کے بعد شہزادہ گل اپنی مراد کو پہنچتا ہے اور صنوبر سے شادی ہوتی ہے۔

(۷) بہار دانش :۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ پیش نظر نسخے کے اختتام پر جو عبارت درج ہے چونکہ اس سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔

"پوشیدہ نہ رہے کہ قصہ دل چسپ جہاندار شاہ اور بہرور بانو کا منشی عنایت اللہ نے اگلے زمانے میں الفاظ شیریں اور عبارت رنگیں سے زبان فارسی میں تصنیف کرکے بہار دانش نام رکھا۔ اکثر آدمی ہر دیار کے سبب فارسی کے نہ سمجھنے میں اس قصے کے محروم رہتے تھے۔ اس واسطے افصح الفصحا ابلغ البلغا مرزا جان طپش مرحوم نے بموجب فرمائش صاحبان کونسل وغیرہ کے سنہ بارہ سو سترہ ہجری (۱۲۱۷ھ) میں خاص و عام کے سمجھنے کے لئے زبان اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مگر باعث عدم

چھاپا ہونے کے سبب شوق مند قائدے سے اس قصے کے محروم [illegible]
مرزا شیر علی بنگالی اور محمد فیض اللہ نے اس کتاب کو بہت سعی و کوشش [illegible] بہم پہنچا
صحیح کر کے محمدی چھاپ خانے میں ٹیپ کے چھاپے سے سن بارہ سو [illegible] ہجری
میں چھپایا تاکہ ہر چھوٹے بڑے اس قصے سے واقف ہو کر خاکساروں کو دعا دلی
سے یاد کریں۔ ثانیاً بہ سبب نایاب ہونے اس قصے دلچسپ کے [illegible] میں
چھپا تھا اور اب دوبارہ حسب الخواہش ساتھیوں کے بشراکت محمد حسین صاحب
منشی محمد سلیم صاحب کے مطبع محمدی میں سنہ ۱۲۶۸ ہجری میں زیور طبع کا پہنا۔"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ فارسی میں عنایت اللہ نے اس کی تصنیف کی تھی اور بعد میں مرزا جان طپش نے ترجمہ کیا اور پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۵۵ھ اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۲۶۸ھ یہ کتاب بمبئی میں طبع ہوئی ہے۔ مثنوی (۱۴۹) صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ کے متن میں (۱۵) شعر اور حاشیہ میں بھی شعر ہیں (۶۶) عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ آخر پر عنوان کی فہرست بھی درج ہے۔

حمد و نعت منقبت حضرت علی کے بعد سبب تالیف کتاب اور اس کے بعد تعریف عہد صاحبان عالی شان کا عنوان ہے اور پھر گورنر جنرل کی تعریف، اس کے بعد صاحبان کونسل و صدر و نکلش صاحب کی تعریف کے بعد داستان شروع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں گورنر جنرل لارڈ منٹو تھے۔ شروع کے چند شعر یوں ہیں :-

بیان کیا کروں حمد پروردگار	کہ عجز بیان سے ہوں بس شرمسار
کہ طاقت کہاں اس قدر نطق کو	جو تمہید اس کی سرانجام ہو
زباں کو تکلم کا یارا نہیں	تعقل کا بھا کچھ گزارا نہیں

گورنر کی تعریف

گورنر بہادر معلی جناب	کہ جس کا ہوا لارڈ منٹو خطاب
افادات جس کے ہیں شام و سحر	معنی ادھر اور ادھر

اس اقلیم کا تخت ہو فرماں روا   تسلط رہے اس کا یونہیں سدا

آغاز داستان

سلف میں کہیں کوئی تھا بادشاہ   برآرندہ تخت و تاج و کلاہ

شہ عادل و خسرو داد گر   معین ستم دیدگان ہر سحر

سدا قیصر روم خاقان چیں   رہا کرتے اس کے اطاعت گزیں

بہار دانش (۲ تا ۱۹) بارہ قصوں کا مجموعہ ہے جو حسن کردار کے لئے لبطور نصیحت لکھی گئی ہیں اس کے دو نسخے اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ سنہ ۱۲۷۲ھ (سنہ ۱۸۵۶ء) کا مطبوعہ ہے اور دوسرا نسخہ سنہ ۱۳۱۵ھ (سنہ ۱۸۹۸ء) کا ہے دونوں نسخے بمبئی میں طبع ہوئے ہیں۔ دونوں طباعت میں قصے تو وہی ہیں مگر ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا فرق یہ ہے کہ سنہ ۱۳۱۵ھ میں متن اور حاشیہ میں ایک ہی قصہ ہے اور اس کے اختتام پر دوسرا قصہ شروع کیا گیا ہے اور سنہ ۱۲۷۲ کے نسخہ میں آغاز ہی سے متن میں ایک قصہ اور حاشیہ میں دوسرا قصہ لکھا گیا ہے۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں جو نسخہ طبع ہوا ہے اس کے ٹائیٹل پر حسب ذیل عبارت طباعت کے متعلق درج ہوئی ہے۔

"الحمد للّٰہ والمنۃ کہ یہ نسخہ مرغوب ہر دلاں خوشتر سامان افسریہ مسمی بارہ قصہ ان دونوں بالکل نایاب تھا۔ اس واسطے بندہ رب الکریم ابراہیم بن قاضی نور محمد یکندری نے جزیرہ معمورہ بندر بمبئی کے مطبع حیدری میں بتاریخ ۲۸ ذی حجہ سنہ ۱۲۷۲ھ میں زیور طبع پہنایا"

یکے بعد دیگرے ان بارہ قصوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) لال و گوہر اس کا مصنف عارف الدین خاں عاجز تخلص ہے اس مثنوی کی تصنیف سنہ ۱۱۵۰ کے بعد ہوتی ہے صحیح سنہ معلوم نہیں ہوا اس کے قلمی متعدد نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ آغاز یہ ہے۔

الہٰی دے مجھے رنگیں بیانی عطا کر مجھ کو یا قوت معانی

یہ ایک عشقیہ داستان ہے ہیرو لال شاہ اور ہیروئن گوہر پری ہے ہیرو عاشق ہوتی اور کامیاب ہوتی ہے۔ اختتام اس شعر پر ہوا ہے :۔

الٰہی عاشقوں کی آبرو رکھ انھوں کو دو جہان میں سرخ رو رکھ

(۲) قصہ زیتون و محمد حنیف :۔ اس داستان کا مصنف وتی ہے مگر اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس مثنوی کا قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ داستان میں محمد حنیفہ اور زیتون شہزادی ہیروئن ہیں، محمد حنیفہ کا زیتون شاہ سے جنگ کرنا، بعد فتح اسلام کی تبلیغ کرنا پھر کامیاب ہو کر مدینہ کو واپس آنے کی صراحت ہے۔ مثنوی کے اختتام میں اس کی طباعت وغیرہ کے متعلق بھی اشعار لکھے گئے ہیں۔ آغاز یوں ہے :

الٰہی دو عالم کا کرتار تو دونوں جگ کا پیدا کرنہار تو
کیا اپنی قدرت سے خلقت ظہور زمین آسمان اور ملائک وحور

اختتام میں طباعت کے متعلق کئی امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

الٰہی مصنف رہے خوش خرام بحرمت بنی اور آل کرام
بزان حاجی صاحب کو تولے کریم علی بھائی پر کر تو د اور نعیم
جو از نور احمد ہوا نام ور اوسے دین و دنیا میں کر بہرہ ور
وہ فیاض فیروز ہے کامیاب چھپائی ہے اوس نے ستویہ کتاب
جو بارہ قصے تھے اونے اب لکھائے دیا چھاپ خانہ میں اپنا چھپائے
اصل ہے وطن ان کا سورت بندر مگر ہیں مدت سے بمبئی کے اندر

اس کے بعد پانچ شعر ہیں۔ محمد حنیفہ کے متعلق دکہنی زبان میں کئی داستانیں لکھی گئی ہیں جو علیحدہ علیحدہ مضمون پر مشتمل ہیں۔ اس خصوص میں میں نے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے جو رسالہ اردو میں شائع ہوا ہے۔

(۳) قصہ لیلیٰ مجنوں :۔ اس مثنوی کا مصنف عبداللہ واعظ ہے اور اس کی تصنیف ۱۰۹۶ھ میں ہوئی ہے چنانچہ آغاز یعنی مدح و نعت منقبت کے بعد مصنف نے اپنے متعلق اور تاریخ تصنیف کے متعلق صراحت کر دی ہے۔ آغاز اس طرح ہوا ہے :

الٰہی بخش مجھ کو نور وحدت ۔۔۔ کہ جاوے دل سے میرے سب کدورت
الٰہی بخش تو عرفان مجھ کو ۔۔۔ نبی کی لے مدد کہتا ہوں تجھ کو
یہ عبداللہ غلاموں بیچ کمتر ۔۔۔ الٰہی کر دے دو جگ میں بہتر
زبان دکھنی میں اک قصہ سناؤں ۔۔۔ سنہ ہجری میں سو لکھ کر سناؤں
گیارہ سو[۱۱۰۰] اوپر تھے پر چھنوں[۹۶] ۔۔۔ لکھا ماہ صفر میں لیلیٰ مجنوں
وقت تھا ظہر کا تاریخ دسویں ۔۔۔ رکھی میں نے پیر کے دن بات دل میں

اختتام یہ ہے

ہوئی قصہ کی اب یہاں سے تمامی ۔۔۔ کرو تم عاشقوں کی سب غلامی
میں عبداللہ واعظ ابن اسحاق ۔۔۔ خدایا بھیج میرے غم کا تریاق
شروع قصہ کیا دسویں صفر کو ۔۔۔ وہ دن تھا پیر کا وقت ظہر کا
مہینے ایک میں قصہ لکھا تھا ۔۔۔ ستو سورت میں یہ قصہ بنا تھا

اس سے واضح ہے کہ داستان سورت یعنی گجرات میں تصنیف ہوئی ہے اور عبداللہ اس کا مصنف ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی داستان مشہور ہے، اس لئے اس کی صراحت غیر ضروری ہے۔

(۴) قصہ بیر الالم :۔ اس مثنوی کا مصنف عظیم الدین ہے اور اس نے اختتام پر اپنے نام کی صراحت بھی کر دی ہے۔ آغاز یہ ہے :

کہوں میں حمد رب العالمین کا ۔۔۔ جو قاوند ہے دنیا و دین کا
کیا اظہار قدرت خوب اپنا ۔۔۔ بنایا نور سے محبوب اپنا

داستان کا سنہ تصنیف واضح نہیں ہوتا۔ اس مثنوی کے قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ

یکتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ مگر کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ میں مضمون میں کسی قدر تبدیلی ہے
یصنف کا نام بھی بدلا ہوا ہے عظیم الدین کے نام کی صراحت ملاحظہ ہو۔

عظیم الدین اب خاموش کر تو ذکر اتمام کر صلواۃ پڑھ تو
ہوئی ہے جنگ کی اتمام بات محمد پہ کہو سب مل کے صلوات

کتب خانہ سالار جنگ کے نسخہ میں مصنف کا نام میر باقی ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

تو کر میر باقی سے مشکل کو حل ہر ایک آن میں کرتو او سیر فضل

کتاب کے نام میں کس قدر فرق ہے ممکن ہے یہ کتابت کی سہو ہو۔ یہاں کتاب کا نام بیر العلم
ما گیا ہے۔

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلعم کسی جنگ پر تشریف لے گئے، ایک
ام پر پانی نہیں تھا پانی لانے کے لئے حضرت علی کو روانہ کیا گیا۔ آپ ایک بت پرست
ڈھے کو ہمراہ لے آئے جن کو پانی کا مقام معلوم تھا، اس نے کہا اس جنگل میں ایک بھوت رہتا
ہے، اگر اس کو قتل کر دیا جائے تو وہ پانی فراہم کر دے گا۔ آں حضرت نے ایک صحابی سعد کو
وت سے لڑنے کے لئے روانہ کیا مگر بھوت نے ان کو ہلاک کر دیا اور آں حضرت پر وحی آئی
۔ اس بھوت کو بجز حضرت علی کے کوئی قتل نہیں کر سکتا، اس کے بعد آں حضرت صلعم نے حضرت
ی کو روانہ کیا۔ آپ نے بھوت کو قتل کر دیا اور سعد کی کٹی ہوئی گردن جسم سے لگا دی اور سعد فوراً
ندہ ہو گئے۔ اس معجزہ کو دیکھ کر وہ بوڑھا اور اس کی بی بی اسلام سے مشرف ہوئے۔

(۵) قصہ وفات نامہ بی بی فاطمہ :- اس کا مصنف طالب ہے جو گجرات کا باشندہ
تا۔ کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اس میں جیسا کہ
م سے ظاہر ہے، حضرت بی بی فاطمہ کے انتقال کا حال لکھا گیا ہے۔

آغاز:

کروں ابتدا میں بنام خدا کہ ماٹے جلاوے و پالے سدا

محمد نبی سید المرسلین　　　حبیب خدا رحمت العالمین

اختتام یہ ہے

قیامت میں طالب شفاعت کے دن　　　شفاعت سے بخشے مجھے بیچ تن

ہوا آخر آکے قصہ تمام　　　نبی پر درود ان اچھو اور سلام

سالار جنگ کے مخطوطہ سے اس کا مصنف "امین" ظاہر ہوتا ہے۔ مطبوعہ اور قلمی مثنوی اشعار کی کمی وبیشی ہوئی ہے۔

(۶) قصہ تمیم انصاری :۔ اس نام کی کئی منظوم اور نثری داستان کا پتہ چلتا ہے جن میں سے بعض کے مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں مگر تمام داستانوں کا قصہ ایک ہی ہے جس میں ایک صحابی تمیم انصاری کے زبانی عجائبات دنیا کا تذکرہ کیا گیا ہے آغاز یہ ہے۔

ثنا اور حمد مومن کی ستو تم　　　جواہر اور بیچے موتی چنو تم

دیکھو کیا کہیں ہے اوس پاک رب کا　　　تماشا دیکھتا ہے آپ سب کا

اس منظوم داستان کا مصنف غلام رسول غلامی گجراتی ہے۔ چنانچہ خاتمہ میں اس کا تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

غلامی اس سوا مت مانگ کچھ غیر　　　رہے ایمان سلامت عاقبت خیر

غلام رسول نام ہے گا مرثیوں میں　　　تخلص مطلب ہے سب ریختوں میں

مناقب مدح میں اور مدامی　　　ہے قصوں میں لقب میرا غلامی

میرا مولود ہے در شہر سورت　　　کیا کھمیات میں چند مدت سکونت

یہ قصہ فارسی تھا نثر منقول　　　کیا ہیں اس کو ہندی نظم بے مول

تھی فرمائش جو کہتا ابھی نکی یوں　　　کہ تم ہندی کرو اس فارسی کون

جدا لاکر دیا اس کی اصل کو　　　تتبع میں کیا ہندی نقل کو

بہت تاکید سعید الدین کی تھی ۔۔۔۔ میاں جعفر نے بھی کچھ کم نہیں کی

سنہ بارہ سوا ٹھارہ کے درمیان ۔۔۔۔ تھی تاریخ چودھویں اور ماہ شعبان

یں کھمبات میں اس کو کہا تھا ۔۔۔۔ ہند اروں کی مسجد میں لکھا تھا

جمعہ کی صبح ٹھنڈ میں کی سرسری تھی ۔۔۔۔ وہ مسجد و دوست داران سے بھری تھی

... ...

بتیان نوسوا و پر چالیس پر دو ۔۔۔۔ ہوئی اس قصہ کے فی الجملہ گن لو

ابھی قصہ یہاں بس کر غلامی ۔۔۔۔ درود ان پڑھ محمد پر مدامی

(۷) قصہ قاضی و چور :۔ اس مثنوی کے مصنف کا نام نور اللہ ہے اس میں ایک داستان قاضی اور چور کی لکھی گئی ہے چور نے اپنے علم کی جدت سے قاضی کو مجبور کر دیا اور بازی جیت لی ہے۔ ابتدا یوں ہے:

کروں حمد اول خدا پاک کا ۔۔۔۔ کرن ہار صاحب جو افلاک کا

نہیں غیر کوئی اس کے کوئی کردگار ۔۔۔۔ کیا جس نے دو جہاں آشکار

مثنوی کے اختتام پر مصنف کے نام وغیرہ کی صراحت موجود ہے اور سنہ تصنیف بھی واضح کیا گیا ہے فارسی سے ترجمہ کرنے کی بھی صراحت کی ہے۔

اول فارسی تھی سو دکھنی کہا ۔۔۔۔ بنا کر حوالے خدا کے کیا

بنایا نور اللہ نے قصہ لکھا ۔۔۔۔ علی خان بہادر چھپایہ کیا

وہ تاریخ چھٹی تھی رمضان کی ۔۔۔۔ نشانی تھی مومن کی ایمان کی

رجب کی دھم اب ہوا یہ ختم ۔۔۔۔ اٹھارہ برس بار سریں تھے کم

قصہ چور و قاضی کا کہنا تمام ۔۔۔۔ درود ان محمد پہ بولو سلام

قلم سے محمد کے لکھا گیا، ۔۔۔۔ حمایت سے جامی کے چھپایا گیا

اس سے واضح ہے سنہ ۱۲۸۲ھ میں فارسی سے دکھنی نظم میں منتقل ہوئی ہے۔

(۸) قصہ تنبولی کی عورت کا :- ایک تنبولی کا قصہ اس مثنوی میں نظم کیا گیا ہے۔ آغاز مثنوی کی ابتدا میں ایک مختصر نثر ہے جو حسب ذیل ہے۔

"یہ قصہ تنبولی اور تنبولن کا جس نے اپنے مرد سے فریب کیا اور غیر مرد پر فریفتہ ہو کر اپنا گھر برباد کیا ......"

نحوست کا قصہ ہوا اب شروع کسی مسخرے نے کیا جو رجوع
کیا اس طرح کا ادنیٰ چرتر ایک نہیں مانتے بات اس کی جو نیک

قصہ کے اختتام پر چند اشعار ہیں۔ پند و نصیحت کے ہیں۔

سنو اے عزیزو تمہیں کان دھر کہ عورت میں ہیں کئی فن مکر
زنوں کے مکر کا نہ حد و حساب لکھوں گر تو ہوئے یہاں صد کتاب
کہ ایک پل میں وہ لاکھ حکمت کرے سچی بات ناری و جھوٹی کرے
نہیں بات عورت کی سنتا ہے جو کہ راحت سے دن رات جیتا ہے او

تنبولی کا گھر بار کر دے تباہ خدا ان کو مکروں سے دیوے پناہ
میں بندہ ہوں تیرا ضعیف اے الٰہ میں عاصی ہوں تیرا تو بخشے گناہ

ممکن ہے عاصی اس کا مصنف ہو مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

(۹) قصہ جمجمہ :- اس نام کی ایک مثنوی کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور کتب خانہ سالار جنگ میں دو نسخے ہیں۔ مگر اشعار میں کمی و بیشی ہے۔ اس داستان میں عیسیٰ علیہ السلام سے ایک انسانی کھوپڑی جو کسی بادشاہ کی تھی گفتگو کرتی ہے۔ کھوپڑی اپنے گزشتہ عظمت اور شوکت کا حال اور اپنا انجام بتاتی ہے۔ ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے :-

ناگہاں قدرت خدا سے یوں ہوا جن زمین و آسماں پیدا کیا

آخر کے چند شعروں میں مصنف نے اپنا نام بھی ظاہر کیا ہے۔

کہتا ہے عبداللہ مجھ پر کر کرم ‏ ‏ بالطفیل حضرت خیر الانام
یعنی آں ذات مبارک دستگیر ‏ ‏ ہیں محی الدین جو پیراں پیر
معجزہ عیسیٰ کا اب کر تمام ‏ ‏ حضرت احمد نبی پر کہوں سلام

ایک قلمی نسخہ میں "کمترین" تخلص آیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کمترین سخن تو کر بیان سے تمام ‏ ‏ بھیجو پیغمبر پر صلوات وسلام

ممکن ہے مثنوی لیلی مجنوں جس کا تذکرہ نمبر (۳) پر کیا گیا ہے وہی اس مثنوی کا بھی مصنف ہو۔

(۱۰) قصہ چوھا اور بلی :۔ مطبوعہ نسخوں کے علاوہ اس مثنوی کے دو قلمی نسخے بھی کتب خانہ سالار جنگ میں ہیں مگر دونوں میں آغاز کے اشعار نہیں ہیں اگرچہ بسم اللہ کے ساتھ مثنوی آغاز ہوا ہے۔ اس مطبوعہ داستان کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں :۔

خدا ہیگا خالق خلق کا تمام ‏ ‏ کیا جنّے پیدا سب ہی خاص و عام
جنے انس و جیواں و وحش و طیور ‏ ‏ سبھی روح والے سو اوس کا ظہور

اختتام میں مصنف کا نام بھی درج ہے۔

پھیلائی ہے کیا مکر یہ بلی ‏ ‏ چوہے سات سو کھا کے حج کو چلی
ہوا اب یہ قصہ یہاں سے تمام ‏ ‏ شرف دین اس کو کیا اختتام

آخری میں اشعار بھی کسی قدر تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایک نسخہ میں شرف الدین کا تخلص ظاہر ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

دیکھو کیا او مکر کرے یو بلی ‏ ‏ چوہے سات سو کھا کے حج کو چلی
یاں سوں سارا یو قصہ تمام ‏ ‏ ہمیں یوں کہتے ہیں مدنؔ نیک نام

اس سے واضح ہے کہ شرف الدین اس کا مصنف ہے اور اس کا تخلص "مدنؔ" ہے۔

(۱۱) قصہ نازنین و پٹھان :۔ اس داستان کا آغاز یہ ہے۔

ثنا حمد کو ہے دائم مدام ‏ ‏ کئے جس نے پیدا سبھی خاص و عام

وہ ستار و غفار ایزد تعالیٰ جو رازق خالق وہ ہے ذوالجلال

اس میں ایک پٹھان اور ایک نازنین کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ نازنین کئی سوالات پٹھان سے کرتی ہے اور پٹھان جواب دے کر نازنین کو قایل کر دیتا ہے اور نازنین مسلمان ہوتی ہے۔ اس مثنوی کا مصنف کوئی شاعر حامد ہے۔ یہ تخلص متعدد شعروں میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

شرف ہے مسلمان کا سب پر اتم اے حامد تو قصہ کو کر دے ختم
قصہ ناگری کا سنا تھا اصل کیا اسکے اوپر سے میں نے نقل
لکھا اس کو میں نے سوا نجار میں مہینے مبارک ہو رمضان میں
جو تاریخ رمضان کی تھی بیسویں وہ تھی نیک ساعت سنو پاک دیں
اے حامد بس اب تو نو بکرا نہ کر پورا کر تو قصہ ابھی زود تر
نہ کر اس کے آگے ذرا کچھ کلام نبی پر تو بھیج اب درود و سلام
وہ حامد کی کچھ بنی سنو زار دیوم اسی کی تھی انجار میں سکر دھوم

(۱۲) قصہ کالی و گوری کا :- یہ ایک مختصر مثنوی ہے ایک شخص کی دو عورتیں تھیں، ان میں ایک کالی اور دوسری گوری تھی ان کی سیرت کو داستان میں واضح کیا ہے۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں

شخص اک شہر سورت میں دسکی جورواں تھے دو کہلے گوری دوجی سانولی دونوں پردہ رہا تھا جو
کمانیکو سو وہ نکلا گیا پردیش میں چل کر روپے کتنے کما لایا پھر آیا اپنے گھر دل کر

قصے کے اختتام پر تاریخ تصنیف کی صراحت بھی ہو گئی ہے

کہ سنہ یکہزار دو سو پر سولہ ہوئے تھے جب قصہ یہی میں نے لکھا مہ شعبان میں تب

" جناب قاضی عبدالکریم صاحب نے اپنے مطبع نامی کریمی واقع بمبئی میں زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ کیا "۔ اس تفصیل سے سنہ ۱۸۵۰ء کے قبل کی بعض مطبوعہ منظوم داستانوں کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتے ہیں اور کچھ مفید باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو ریسرچ کرنے والوں کے لئے کار آمد ہو سکتی ہیں۔

فلاح کی راہ

جناب محمد ذاکر

(۱)

آج ہم جس بے کسی اور ناداری کی حالت میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مغرب، اخلاق، جگہ یا فصل کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اپنی ہی طرف پلٹ آتا ہے قوموں کی تاریخ میں اجتماعی مقصدی اور ذہنی کجروی کی مثال ہمارے موجودہ خستہ اعمال کے علاوہ شاید اور کوئی نہ ہو۔ ان گنت لوگ ملک سے بغیر کسی خاص مقصد کے دوسرے ملک تک چلے جاتے ہیں۔ اپنا بیش بہا وقت اور خون جگر سے پیدا کی ہوئی اپنی ہیچ مایہ معیشت بے مقصد لٹا کے مفلس قلانچ ہو کر پھر اپنے وطن کی گود میں آپڑتے ہیں۔ اقتصادی اور معاشی حالت جس پر کسی قوم کی سماجی، سیاسی اور تمدنی بقا اور ترقی کا دارومدار ہے، اس کا مرقع کھینچنے کے لئے کسی شاعرانہ مبالغہ کی ضرورت نہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے شعبوں میں برائے نام ہمارا ذکر آجاتا ہے۔ اونچی سطح کے محدود سے چند افراد کو چھوڑ کر جن کی زندگی کو خضرِ راہ بنا کر ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے، وہ نوجوان طبقہ جس سے قوم کا مستقبل بنتا یا بگڑتا ہے بے حسی اور قنوطیت کے کسی نامعلوم اندھیرے تیرہ و تار غار میں سر منہ اوندھائے پڑا ہے جو زندگی کا کوئی پتہ نہیں۔ کبھی کوئی ہوش میں آتا بھی ہے تو کسی بے نشان آسمانی فرشتہ کی بشارت کا منتظر رہتا ہے۔ اور بس پھر وہی خواب گراں، پھر وہی اذیت کوش بے حسی! کوئی اور آگے بڑھتا ہے تو لیلیٰ حکومت کا ادنیٰ غلام بننے کی آرزو میں گھلا جاتا ہے اور اس تیز رفتار صنعتی ہنگاموں کے پروردہ پرآشوب زمانہ میں اپنی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد شعر و ادب کی نظر فریب بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو اسیر کر لیتا ہے۔ رنگین عبارت آرائی یا پھر مدفن اسلاف کی سجادہ نشینی پر قناعت کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ پھر یہ لوگ خود کو تو کسی مقصد عظیم سے کبھی وابستہ نہیں کرتے مگر دوسروں کی ذرا سی

لغزش پر مین میکھ میں ہو جاتے ہیں۔ دوسرے کی آنکھ کے تنکے کو شہتیر بنا بنا کر پیش کرتے رہتے
نئے تعلیم یافتہ کچھ "روشن خیال" ایسے بھی ہیں جن کو محرومی اور بے نیازی نے احساس کمتر
اس انتہائی پرخطر کنارے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں "کسی نوید کا امکان ہی نہیں" ان کے نزدیک
کا ایک ایک فرد گردن زدنی ہے۔ بہترین حل یہ ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑے، قہر و غضب
ہر نشیمن کو جلا کر راکھ کر ڈالیں، ہر ایک طائر کو چن چن کر پھونک دیں۔ جلد از جلد غرقاب
یہ کشتی جس کے ملاح تند و تیز طوفان کے پیہم جانکاہ ہچکولوں سے بھی ہوش میں نہ آتے ہوں۔
ہو جائے یہ جہان، آتش فشاں پہاڑ اپنے دہانے کھول دیں، زمین پھٹ پڑے اور زندگی کا
ذرہ کوئی نام و نشان نہ رہے۔ ماضی سے نالاں، حال سے بیزار، مستقبل سے بے پروا، یہ۔
ہمارے نوجوانوں کی ذہنی جودت اور بلندیٔ فکر!

قوم کے وہ لوگ جن کو نا سمجھ اور جاہل عوام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کے متعلق
یقین ہے کہ مذہب کے نام پر وہ کسی وقت بھی یکجا ہو کر قومی زندگی کی تشکیل میں حصہ لے
ہیں ان کی حالت اور زیادہ نازک ہے۔ مذہب کی اسپرٹ تک تو ان کی پہنچ کے متعلق
بھی کبھی خیال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محض جذبات کی بنیاد پر ان کو اکسا اکسا کر ہمیشہ کام لیا
گیا ہے اور اس کا نتیجہ آج سب پر روشن ہے۔ ان میں اب نام نہاد قومی غیرت اور حمیت
کا بھی پتہ نہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان کی پابندی کجا خود مساجد اور قومی درسگاہوں
کی وہ ظاہری رسمی تعظیم بھی نہیں رہی۔ آدھی آدھی رات تک مسجد کے زیر سایہ مسلم ہوٹلوں میں
سستے بے ہودہ گانوں پر سر دھننے والوں کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔

ہر طرف پُر ہول تاریکی ہے۔ کم ہمتی، بزدلی، نامرادی اور بربادی کے پست اور تاریک
غاروں کے ہیبت ناک دہن کھلے ہوئے ہیں۔ ایسی بے خبری اور بے حسی کی نیند پڑ کر سبھی مبہوت سے
پڑے ہیں۔

(۲)

قوم کی کشتی کو ضلالت اور جہالت کے اس خوفناک جانکاہ بھنور سے نکالنے کے لئے

ی ہے کہ ہر فرد کے دل میں ایک امنگ پیدا ہو، اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہو، نئی
د. کوئی آئیڈیل، کوئی لائحہ عمل ہمارے سامنے موجود ہو اس کی اہمیت سے ہم پوری طرح واقف
را س کو حاصل کرنے کی دھن میں ہم کسی مشکل کو مشکل نہ سمجھیں۔ آسمان اتنا سخت نہیں ہے اور
، گو دہی کبھی اتنی تنگ ہو سکتی ہے۔ جمہوری نظام کے لئے (خاص طور سے وہ جو نیا نیا قائم ہوا
سے بڑا خطرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ملک کی آبادی کا ایک حصہ پسماندہ اور بے حس ہو جائے
ب سے پہلے اپنی اقتصادی تنظیم پر زور دینا ہوگا۔ یہ کام شروع میں جتنا کٹھن معلوم ہوتا ہے
ضروری بھی ہے۔ تمام ملک کے لئے منظور شدہ کسی ہمہ گیر اقتصادی پلان کے تحت جمہوری
یا کسی ایک جماعت کی اقتصادی تنظیم کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے۔ جمہوریت کا مفہوم
ہے کہ ہر فرد بشر، ہر فرقہ و جماعت یکرنگ ہو جائے۔ اس کا مقصد تو قوس قزح کے
ف رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ اتنے بڑے ملک میں میرے خیال میں جمہوریت کے معنی
، یہ ہیں کہ چھوٹے بڑے مختلف گروہوں کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ان کو ایک
رے سے قریب لایا جائے۔ اکثریت کے غالب آجانے کا خوف بھی نہ رہے اور اقلیتی
بھی احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ قومی منصوبوں اور مجوزہ سماجی نظام کے تحت سب
پنی جگہ مطمئن بھی رہیں اور منظم بھی اور ملک کی ترقی میں بھی سب شریک رہیں۔

اقتصادی تنظیم کے سلسلے میں اس وقت باریک فنی باتیں نہیں اٹھاؤں گا مگر سرسری طور
س حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ انفرادی
ن سے بڑے پیمانہ پر کوئی صنعت کھولی جائے کیونکہ اول تو بڑی بڑی صنعتیں کھولنے کا کام
ر حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور (Private Sector) کا میدان محدود
ہے۔ ویسے بھی یہ انفرادی نفع اندوزیوں کا زمانہ نہیں ہے۔ دوسری بڑی اور زیادہ اہم وجہ
کہ بڑی صنعتیں قائم کرنے کے لئے سرمائے اور تجربے کا ہونا اولین شرط ہے جو ہماری قوم میں
ب قریب مفقود ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اسکے اسباب کی تفصیل میں جانے کا یہاں کوئی موقع نہیں

ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں بھی کم وبیش مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر نہیں قائم کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اقتصادی تنظیم اور معاشی بحالی کے نتائج جلد دیکھنے کے لئے بڑی بڑی صنعتوں کے مقابلہ میں چھوٹی گھریلو قسم کی صنعتیں زیادہ مفید ہیں۔ درحقیقت اپنے پیروں کھڑا ہوکر عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں امداد باہمی کے مرکز کھولنے ہوں گے۔ دونو قسم کے پیداوار کے لئے بھی اور یکری سیلائی کے لئے بھی۔ یہ دراصل گھریلو صنعتیں اور اس طرح بنائے ہوئے مال کے نکاس کے مرکز ہوں گے گھریلو دستکاریاں جن کو چلانے کے لئے نہ تو کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ برسوں کے تجربہ ہی کی لوہاری، تجاری، جفت سازی دھات کا کام، پارچہ بافی اور سرد وزی وغیرہ ایسے کام ہیں جو ہماری قوم میں ہوتے بھی آئے ہیں اور اول الذکر دو تین کاموں کو چھوڑ کر ان کو ہماری پردہ نشین عورتیں بھی بآسانی کر سکتی ہیں اور کم تعلیم یافتہ مرد بھی۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اب یہ کام ذرا تنظیم سے ہوں۔ امداد باہمی کے یہ مرکز بالکل جاپانی نمونوں کے ہوں جن میں نہ کام کرنے والوں کو ہی زیادہ الجھن ہو اور نہ تنظیم کرنے والوں ہی کو پیچ در پیچ منزلوں سے گذرنا پڑے۔ پیداوار اور تقسیم کے ایسے اداروں کا تمام قوم میں ایک جال بن جائے۔ ہر مسلم محلہ میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں مسلمان عورتیں جو سینے پرونے اور بنائی وغیرہ کے کام میں کسی طرح بھی کسی سے پیچھے نہیں، جاکر کام کریں یہ کام مختلف مرکزوں پر بھی ہو سکتا ہے اور گھروں میں بالکل آزادانہ بھی۔ مقررہ وقفوں سے ان تمام سنٹروں سے تمام پیداوار اکٹھی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایک جگہ جمع کرکے اس کی جدید سائنٹفک طریقوں سے فروخت کا بندوبست آسانی سے ہو سکتا ہے۔ حکومت خود بھی چاہتی ہے کہ ملک کے تمام شہروں اور دیہات میں ایسی گھریلو دستکاریوں کا ایک جال بچھ جائے۔ حکومت کے قائم کردہ گھریلو دستکاریوں کے شعبے اور انڈین اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ اور اسی قسم کے دوسرے ادارے اس سلسلہ میں بے حد مددگار ہو سکتے ہیں۔

اقتصادی تنظیم کے ساتھ ساتھ ہمیں تعلیم پر بھی جو متفقہ طور سے قوم کے دیرینہ امراض کی

واحد دوا ہے، پوری پوری توجہ دینی ہوگی۔ مذہبی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کرنا ہوگا۔ پرانی طرز کے مکتبوں میں قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم کی طرف بھی دھیان دینا ضروری ہے۔ جن جن پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں مسلمان بچے پڑھتے ہیں وہاں ان کی مذہبی تعلیم کا معقول انتظام کرانا ہوگا۔ ہندی کے ساتھ مادری زبان کی اہمیت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تعلیم نسواں پر خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنی ہوگی۔ لڑکوں میں ثانوی تعلیم کے بعد عملی ٹیکنکل تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہئیے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے قائم کردہ پیشہ وارانہ رہنمائی کے مراکز (Vocational Guidance Centers) سے زیادہ مدد لینی ہوگی۔ قوم کے وہ افراد جو کسی طرح بھی قوم کی خدمت کر سکتے ہیں انھیں زیادہ سے زیادہ قربانی کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔ بے غرض اور بے نفس ہو کر تعمیر کے کاموں میں حصہ لے کر دوسروں کو اونچا اٹھانا ہوگا۔ قوم میں ایک جذبہ اور جوش اور عمل پیدا کرنے کے لئے ہر وقت ذاتی منفعت کے خیال کو چھوڑ کر اپنے آپ کو تیار رکھنا پڑے گا۔

پھر سستی قسم کی سیاست کا شکار ہونے سے بچنے کے لئے جس کا ثبوت اکثر بیشتر ملتا رہتا ہے، قوم کی از سر نو تنظیم کرنی ہوگی، عادات و اطوار سنوارنے کے لئے ہر مسلم آبادی میں ایک ایسا مرکز قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں جمع ہو کر ہم لوگوں کو بحیثیت مسلمان اور بحیثیت ایک ہندوستانی شہری ہونے کے اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے۔ ہر ایک کا یقین اور اعتماد محکم ہو سکے۔ اور تمام ملک کے لئے دوسروں کے ساتھ مل کر عمل کرنے کا ایک نیا جذبہ پروان چڑھ سکے۔

(۳)

یہ سب کچھ جب ہی ہو سکتا ہے، جب قوم کے ہر فرد میں ایک تڑپ، ایک لگن، خلوص کے ساتھ کچھ کر ڈالنے کی ایک مبہم خلش پیدا ہو۔ آج جن خوابیدہ شب پرستوں پر صبح کی درخشانی گراں معلوم ہوتی ہے اور قوم کے وہ ناامید لوگ جو چپ چاپ بیٹھ

بھاں پڑتے ہیں ان میں ایک سیمابی کیفیت پیدا ہونے کی ضرورت ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ سب مل کر کوشش
ہر ایک ایک دوسرے کا کھیوا بنے۔ جوان اپنا عزم اور محنت لائیں، بزرگ اپنے بیش قیمت تجربے اور
ہمہ گیر علم کی روشنی سے رہنمائی کریں۔ ذمہ داری کے وہ فرائض جو پورے ملک نے ان پر عائد کئے ہیں
اسی پر اکتفا کرنا کافی نہیں۔ بڑائی اس میں نہیں کہ دوسرے لوگ ہمیں بڑا کہیں بلکہ اس میں ہے کہ
ہم اپنے چھوٹوں کی دستگیری کریں۔ ان کے دل اپنے ہاتھ میں لیں۔ ترقی کا نیا راستہ دکھائیں ان
میں ہمت اور حوصلہ پیدا کریں۔ ان کو تازگی اور توانائی بخشیں۔ قومی تنظیم کا یہ کام اگر اب نہ
ہوا تو کبھی نہ ہوگا اس وقت غفلت کا ایک لمحہ بھی منزل کو کوسوں دور کر دے گا۔ غبار آلود
فضاؤں کے متعلق یہ یقین کر لینے سے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود بخود صاف ہو جائیں گی اور
نحوست اور ادبار کے روز افزوں بادل خود بخود چھٹ جائیں گے اور خود ساختہ موہوم مصلحتوں
کو مدنظر رکھ کر سکون اور جمود کی حالت میں بے حس پڑے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ اس طرح
ہم اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے ایک خطرۂ عظیم مول لیں گے ایسا خطرہ جس کا اندازہ
ج کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

خوش قسمتی سے ابھی کچھ ایسے شرارے اور بجلیاں موجود ہیں جو اپنی ابدی لپک اور تڑپ سے
دل کو گرما سکتی ہیں اور قوم میں ابھی چند ایسے شوریدہ سر جوان ضرور موجود ہوں گے۔ جن کی حوصلہ افزائی
رنا ہر ایک کا ایک مقدس فرض ہے۔ ابھی ایک ایسی جماعت خواہ وہ کتنی ہی کھوکھلی اور مطعون
ں نہ ہو، موجود ہے جس میں نئے خون اور پرانے تجربے کی آمیزش قومی تنظیم کے دشوار ترین کام
سہل بنا سکتی ہے اگر اس جماعت کے مروجہ ڈھانچے میں رہ کر اس کام کو انجام دینے میں کوئی
ت ہو جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کیونکہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے۔ یہ جماعت کافی عرصہ
اس پر غور کرتی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اس نے کئی اہم اقدامات بھی کئے ہیں، تو کوئی وجہ
ں کہ ہم اپنی اقتصادی پلان کے تحت جمع ہوں۔ اور اپنی اور پورے ہندوستان کی نئی
ندگی کی تشکیل کریں۔ خود حکومت نے ایسے ادارے، جن میں سے کچھ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے

رہیں تاکہ ہر قوم کی اقتصادی تنظیم مضبوط ہو سکے۔ ان تک پہنچنا ضروری ہے جماعتی
سے یہ کام اور سہل ہو جائے گی۔

قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں
پھر اس کی محرابیں اور اطراف وجوانب بھی تیار ہو جائیں گے۔ کشاکش حیات و
ممات اور تسابق اقوام کی کشمکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خواب
ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جایئے اور ایک ہی وقت
میں اس عمارت کے ہر حصہ کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی
تیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت
غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی ؎

ایں رہ عشق است و کج گشتن ندارد باز گشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!"

ابو الکلام آزاد

سیرتِ پاکؐ کی تعلیم

اسلام نے ایک خدا اور ایک دین کا تصور پیش کیا ہے۔ اس نے ایک نظامِ کائنات اور ایک ہی اس کا کارساز تسلیم کیا ہے۔ آج سائنس بھی اصولِ کائنات کی ہمہ گیری کی دعوے دار ہے۔ اسلام میں 'لاالہ اللہ' کا اعلان بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ایک دین کی ابدیت اس کے نشور میں شامل ہے۔ یوں تو ہر دور اور ہر اقلیم میں خدا کے پیغامبر آئے اور ہر ایک نے اپنے طریقے سے اپنے زمانے کے لوگوں کو خدا کا پیغام سنایا اور اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔ لیکن اس زمان و مکان اور زبان و بیاں کے فرق کے باوجود دین اور پیامِ الٰہی ایک ہی رہا ہے۔ اس طرح اسلام نے کسی کو بانیٔ دین نہ بنایا اور نہ بتایا۔ ہمارے رسولِ کریمؐ کو 'خاتم النبیین' کہا گیا ہے۔ یعنی نبیوں میں ایک نبی، آخر الزماں نبیؐ۔ سرتاج نبیؐ۔ یہ بات اسلام کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ اس طرح دین کی ابدیت، سالمیت اور آفاقیت برابر قرار رہتی ہے دین تو اقدارِ مطلقہ کا علمبردار ہوتا ہے۔ اس کے حقائق لازوال ہیں۔ حق کو ضرورتاً یا مصلحتاً وقتاً فوقتاً کم و بیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں حق و صداقت کے چراغ کی لَو مدھم ضرور پڑ گئی ہے اور اس کے نور کو پورے طور پر پھیلانے کی ضرورتیں اکثر پیش آئی ہیں۔ پس ایسے ہی موقعوں پر نبی اور رسول آتے رہے ہیں۔ انسانیت کی راہ پر چلنے کے لئے، رہنمائی درکار ہے۔ اس حاجت کی تکمیل اللہ نے نبوت اور رسالت کے ذریعے کی ہے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے حق کی مدافعت کی ہے اور پیغامِ حق کو خلقِ خدا تک پہنچایا ہے۔ نبی اور رسول سب انسان ہیں۔ ہاں، بلاشبہ اپنے اپنے عہد کے سب سے اچھے اور سب سے سچے انسان۔ قرآن مجید نے بار بار جتایا ہے کہ رسولِ اکرم انسان ہیں ہم میں سے ایک انسان۔ لیکن آج کے اخباری دور میں جبکہ ساری گرمیٔ بازار، زبانی جمع خرچ سے آتی ہے،

جب تک معاملات کو کرامات نہ بنایا جائے، کچھ لطف ہی نہیں آتا۔ اس لئے سیرت پاک کے تذکرے میں بھی واقعات کے بجائے معجزات پر ہی زور دیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت پہلے تو روایت بنی اور اب حکایت بنتی جا رہی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے دستِ قدرت کی کاریگری کے ابدی قوانین کو تسلیم کیا ہے اور واقعات کو ان کا تابع مانا ہے۔ ہاں، بعض نکات کی فہم کے لئے عام فکرِ انسانی، قاصر رہی ہے۔ اور وہ نکتہ اس کے نزدیک معجزہ قرار پایا ہے۔ اس کے ادراک کے لئے ایک خاص قلب و نظر چاہیئے ہیں تو آں حضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ پر توجہ کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول کریم کی زندگی، فقر و استغنا کی زندگی تھی۔ اس میں ذاتی اغراض کی زرا سی بھی کثافت شامل نہیں ہے۔ یہ فقر ہے جسے صرف 'افتقار الی اللہ' ہی کے الفاظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اسی فقرِ نبوی میں وہ صفات آجاتی ہیں جو اجتماعی زندگی کے لئے معجزہ ہیں۔ ان سے ہی ایک بے غرض اور پاک زندگی کا کامل نمونہ سامنے آتا ہے۔ آج کے انسان کی زندگی کا عام مقصد حصولِ دولت ہے۔ جس کی بنا پر معاشرت اور معیشت کے نئے نئے مسائل اٹھے ہیں۔ سیرتِ رسولؐ میں مادی اقدار کی حقارت اور اقدارِ عالیہ کی تعمیر ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم درس یہ ملتا ہے کہ خواہشات اگرچہ نفسِ انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور ان کی گرفت انسان پر بڑی مضبوط ہے لیکن یہ سب اس لئے ہے کہ انسان میں ایک ایسا انقلاب آئے جو وہ ان خواہشاتِ نفس پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ رسولِ کریم کی زندگی میں نہ تن پروری ہے اور نہ اقربا نوازی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے کیسے با اصول لوگ، آج کی دنیا میں اسی ایک کمزوری کی بنا پر کسی طرح بہکتے ہیں۔ لیکن رسولِ پاک کی زندگی میں بیٹی کے ساتھ کیا سلوک نظر آتا ہے۔ پدرانہ شفقت انتہائی ہے۔ لیکن مادی لوازمات کا کوئی تعلق نہیں۔ اپنی آل پر صدقہ بھی حرام فرمایا۔ اسی جذبے کی ایک دوسری کیفیت یہ ہے کہ جب مکہ کی فضا کو

طرح حق کی ترویج کے لئے قطعی ناسازگار پاکر مدینہ کا رخ کیا تو حضرت علیؓ کو لوگوں کی امانتیں سپرد فرمائیں بلکہ دبا لینے کا نہایت ہی مناسب موقع تھا۔ ہجرت کے بعد مجبوری دلاچاری کا زمانہ ختم ہوا۔ مدینہ کی زندگی با اختیار اور با اقتدار زندگی ہے۔ مگر بے نفسی میں ذرا فرق نہیں آیا۔

اسلام، آخرت کی زندگی کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی سے بحث کرتا ہے۔ اس نے شخصیت میں کامل اتحاد کی کارفرمائی چاہی ہے۔ یہاں نہ سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے جدا ہیں، نہ تجارت اور عبادت ایک دوسرے سے الگ اسلام نے عربوں کو نہ صرف قبائلی بلکہ نسلی تعصب سے بھی پاک کر دیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضرت بلالؓ کو غصے میں لعنہ دے دیا کہ ان کی والدہ سیاہ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں ابھی تک جاہلیت کی بُو آتی ہے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان فضیلت کا صرف ایک معیار طے کیا ہے۔ اور وہ ہے تقویٰ۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات کا قطعی قائل نہیں۔ اسلام نے یہ بھی یاد دلایا کہ تمام انسان عالمی برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے۔ اسلام ترک دنیا کا سبق قطعی نہیں دیتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ اس دنیا سے دین بنتا ہے۔ آخرت کی راہ اسی جہان سے ہو کر گزرتی ہے۔ حضور کا ارشاد ہے کہ لوگو! تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، اسلام جسم کو نظر انداز نہیں کرتا۔ حضور نے جسمانی صفائی ستھرائی کی تاکید فرمائی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "پاکی ایمان کا جزو ہے"۔ اپنے گھروں کو کوڑے کرکٹ سے پاک صاف رکھا کرو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ صحت جسمانی کے لئے جسمانی ورزش بھی ضروری ہے آنحضرتؐ نے خود دوڑ کے مقابلوں میں شرکت فرمائی ہے۔ عجیب معاملہ ہے کہ آج کچھ ایسی فضا قائم کر دی گئی ہے کہ صحت، تقویٰ کی ضد ہے، جو کمزور و ناتواں ہو، گوشہ نشین ہو۔ زندگی سے کترائے، اسی پر مردِ مومن کا گمان گزرتا ہے۔

تہذیب کے اس دور میں صرف انسانی حقوق کی ہی بات نہیں ہوتی ہے بلکہ جانوروں کے حقوق کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ہم جانوروں کے ساتھ مناسب برتاؤ کی تعلیم دیتے ہیں! اہل عرب

زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبے کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے۔ ایسے گوشت کو حضورؐ نے مردار کہا جانوروں کو باہم لڑانے اور داغ دینے کی ممانعت فرمائی۔ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانے کو ناجائز ٹھیرایا۔ جاندار کو بلا مصرف محض تفریحاً مارنے کی مذمت کی۔ آج ایسی باتوں کو ہم نئی روشنی سمجھ کر دیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ یہ اسلامی معاشرے میں شامل ہیں اور ان پر عمل کرنا ہی چاہئے۔
اسلام میں حلال طریقے سے روزی کمانا اور رزق تلاش کرنا فرض ہے۔ اگر اس اصول کی ہم پابندی کرنے لگیں تو ذرا غور فرمایئے کہ معاشرت کی کیا تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے۔ آں حضرت صلعم نے روزانہ زندگی کے معمولی معمولی کاموں میں حصہ لیا۔ اور الکاسب حبیب اللہ، فرمایا یعنی کمانے والے اللہ کے دوست ہیں۔

کلام پاک میں مختلف طریقوں سے اکتساب علم پر زور دیا گیا ہے۔ رسولِ اکرم پر وحی کا آغاز ہی قرأت اور علم وقلم سے ہوا۔ حضورؐ نے تمام لوگوں کو علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی۔ عہد نبوی میں ہجرت کے بعد آں حضرتؐ نے مسلمانوں کی تعلیم کا ایک طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ اسے اسلامی نظامِ تعلیم کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ اس میں عورتوں کی تعلیم بھی شامل تھی۔ ہفتے میں ایک دن آپ، خواتین کے مخصوص اجتماع میں شرکت فرماتے۔ ان کو تعلیم دیتے اور ان کے استفسارات کا جواب دیتے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اسلام میں پہلی معلمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضورؐ نے ان سے علم حاصل کرنے کے لئے فرمایا۔ یوں تو مدینہ منورہ میں صحابہؓ کی کئی درس گاہیں تھیں لیکن مدرسہ عالیہ، مسجد نبوی تھی۔ لڑکے، عورتیں اور جن مردوں کا حضرت عائشہؓ سے پردہ تھا، وہ حجرے کے اندر آکر بیٹھتے۔ دوسرے لوگ حجرے کے سامنے مسجد نبویؐ میں تشریف رکھتے اور اسلامی تعلیم کا درس ام المومنین دیتیں۔ رسولِ پاک نے خاک مدینہ سے جو پہلی عمارت اپنے ہاتھوں سے بنائی، وہ یہی مسجد نبویؐ ہے، ہمارا پہلا مدرسہ۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں دنیا میں تیار ہوئیں، ان سب سے مدرسے کا کام لیا گیا۔ استاد مسجد میں بیٹھ کر درس دیتا جو خالصاً للہ ہوتا۔ باقاعدہ مدارس کا آغاز چوتھی صدی ہجری سے ہوا۔

ہمیں یہ بات برابر اپنے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اسلام کی پیروی، مسلمان بناتی ہے۔ یہ کوئی نسلی چیز نہیں کیونکہ ایک شخص اسلام قبول کر سکتا ہے اور ترک بھی۔ گویا اسلام، علم اور عمل کا نام ہے تعلیمات اسلامی کی ترویج کی ذمہ داری خصوصیت کے ساتھ ان حضرات پر رکھی گئی جنھیں نائبینِ رسولؐ کہا گیا ہے۔ یعنی ہمارے عالمانِ دین۔ لیکن در اصل یہ اس وقت کی بات ہے جب تعلیم صرف عالمانِ دین کی ہی ذمہ داری تھی۔ آج دنیاوی تعلیم دینے والوں کا اپنا ایک بہت بڑا نظام ہے لیکن اگر وہ اسلام کے پیرو ہیں تو اُن پر بھی اس تعلیم کی ذمہ داری یقیناً آجاتی ہے جسے صرف عالمان دین کے فرائض میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ یوں بھی ایک اُستاد پر ذہنوں کی تربیت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے کے لئے یہ منصبی ذمہ داری، مذہبی فریضہ اور عبادت بھی بن جاتی ہے۔ اس اہم فریضے کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے اعمال کی درستی درکار ہے۔ اسلام نے اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان بتایا ہے اور اس کا نتیجہ کہا ہے۔ جس مسلمان کے اخلاق و اطوار جتنے اچھے ہوں، اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط سمجھنا چاہیئے۔ رسولِ مقبولؐ کا ارشاد ہے کہ "اچھے خُلق ہی کو اسلام کہتے ہیں"۔ اخلاقی دولت سے بے نیاز ہو کر یا محروم رہ کر کوئی شخص صحیح معنی میں اُستاد، بن ہی نہیں سکتا۔ اُستاد کی مختلف خوبیاں اپنے اپنے انداز میں سب ہی تعلیمی نظام بیان کرتے ہیں۔ نفسیات کے اس عہد میں شخصیت کی مناسب تشکیل کے لئے نمونے کے انسان کی بات بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اور مردِ کامل، کا تصور بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ کسی طور اقدار کی کوئی مُجسّم شکل سامنے آسکے۔ اس باب میں عظیم شخصیتوں، کی مثال سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن پہلی صورت محض مثالی اور خیالی رہ جاتی ہے، دوسری اُدھوری اور ایک رخی، تاہم تعلیمی اور نفسیاتی ضرورتیں ایک ہمہ صفت موصوف کا تصور قائم کرنے کی طرف برابر مائل کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے آپ کو سیرتِ پاکؐ سے نسبت دیتے ہیں یا کم از کم اس کا علم ہی رکھتے ہیں، انھیں خیالات کا طلسمی پیکر تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی خُلقِ عظیم کو ہی سامنے رکھ کر اعمال پاکیزہ سیکھے اور سکھلائے جا سکتے ہیں۔ سیرتِ پاک میں انسانی

صفات کے تمام اعلیٰ ترین محاسن موجود ہیں۔ اور وہ ایک ہم آہنگ زندگی کا معیار پیش کرتے ہیں۔ بہت سے معلمین اخلاق اور رہبران مذہب کی زندگیوں کو انسانی جذبے کی نا آسودگی سے ردِ عمل کے طور پر تشکیل پانے والی زندگی کہا گیا ہے یا بالکل دوسری راہ اختیار کی ہے اور انسان کی صف سے ہٹا کر انھیں مافوق البشر شخصیت بنا دیا ہے۔ رسولِ کریم کی زندگی کا ان دونوں صورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ انسان ہیں انسان کی معراج!

"معلم"

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مکتوباتِ سلیمانی (جلد اوّل) از مولانا عبدالماجد دریابادی

سائز ۲۲×۱۸/۸، حجم ۲۹۸ صفحات، کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ، سنہ طباعت ۱۹۶۳ء
قیمت مجلد پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:- صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

جامعہ کے پچھلے شمارے میں زیر تبصرہ کتاب کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنے قلم کے ذریعے علم وادب، مذہب وملت اور قوم وملک کی جو بے لوث اور عظیم الشان خدمت کی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سید صاحب ان چند اصحاب قلم میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر کے ایک ایک لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک اپنے قلم کو علم ودین کی خدمت کے لئے وقف رکھا۔ ظاہر ہے ایسے مصنف اور عالم دین کی ایک ایک تحریر کس قدر اہم اور پایہ کی ہو سکتی ہے۔ ان کے کچھ مضامین کے مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ ان کی بعد جہاں ان کے حالات زندگی لکھے گئے اور ان کے علمی کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، وہاں ان کے خطوط بھی شائع کیے گئے۔ سب سے پہلے سید صاحب کے عزیز شاگرد اور مخلص معتقد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے ان خطوط کا ایک مختصر مجموعہ شائع کیا، جنھیں سید صاحب نے مرحوم کو لکھا تھا۔ اس کے بعد معارف میں بہت سے خطوط شائع ہوئے اور اب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے، جنھیں مرحوم نے موصوف کو وقتاً فوقتاً لکھا تھا۔ مرحوم کے کل ۳۰۲ خطوط ہیں، جو چالیس سال کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا خط ۱۹۱۲ء کا لکھا ہے، جب سید صاحب الندوہ کے اسسٹنٹ

اڈیٹر تھے اور اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے ساتھ بمبئی کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ آخری خط ۱۹۵۳ء کا ہے، جو وفات سے چند ہفتہ قبل کراچی سے لکھا گیا ہے۔ فاضل مکتوب الیہ نے جابجا توضیحی حاشیے بھی لکھ دئے ہیں، جن سے ان خطوط کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت پہلی جلد شائع ہوئی ہے، جس میں یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء سے ۴ فروری ۱۹۳۲ء تک کے ۲۳۰ خطوط شامل ہیں۔ شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے، جس میں خطوط، خطوط کی بعض شخصیتوں خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد، مکتوب نگار کی شخصیت اور ان کے خیالات و افکار اور مکتوب الیہ و مکتوب نگار کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید صاحب کے جتنے خطوط اب تک شائع ہوئے ان میں میرے خیال میں زیرِ تبصرہ خطوط سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بقول فاضل مرتب "نشیب و فراز، پیچ و خم، جس طرح کہ بشری زندگی کا جزو ہوتے ہیں، ان کی پوری عکاسی ان خطوط میں بھی موجود ہے۔ ۲۷ سال کی عمر بھرپور جوانی کی عمر سے لے کر ۶۷ سال کی پختہ عمر تک جتنی منزلیں طے ہونے کی تھیں سب ہی کے نقشے ان صفحات میں آتے گئے ہیں۔ غم و غصہ، صدمات خانگی، شوخی و ظرافت، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ، دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت، ناگواری و طنز، سیاسی چاشنی سب ہی کی جھلکیاں اپنی اپنی جگہ ان اوراق میں محفوظ ملیں گی۔" (صفحہ ۷، ۸)

غرض یہ خطوط علمی، ادبی، تاریخی ہر لحاظ سے بہت اہم اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ء ۱۸۵۳ء) از محمد عتیق صدیقی

سائز $\frac{20\times30}{8}$، حجم ۳۴۸ صفحات، کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، سال طباعت ۱۹۶۲ء
مجلد قیمت بارہ روپے۔ ناشر: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

محمد عتیق صدیقی صاحب محقق کی حیثیت سے کافی نام پیدا کر چکے ہیں اور کئی مستند اور ضخیم کتابیں لکھ کر دادِ تحقیق حاصل کر چکے ہیں۔ ۶ سال قبل موصوف کی سب سے پہلی اہم کتاب ہندوستانی اخبار نویسی

ڈلہوزی کے عہد میں، شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد موصوف کو حکومت صوبۂ شمالی و مغربی کے مختلف محکموں کی سالانہ رپورٹوں کے انتخابات ملے، جو آج سے کوئی ایک صدی قبل ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئے تھے۔ ان ہی میں چھ سال کے یعنی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک موجودہ اتر پردیش، دلی اور پنجاب کے مطابع اور اخبارات کی رپورٹیں بھی شامل تھیں۔ ان سے اس دور کی صحافتی اور ادبی تاریخ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے اس لئے جناب عتیق صدیقی صاحب نے نئی ترتیب کے ساتھ ان رپورٹوں کا ترجمہ زیر تبصرہ کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ زیر بحث موضوع سے متعلق دوسرے ذرائع سے اگر کوئی مفید بات معلوم ہوئی ہے، تو اس کا بھی حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب جہاں اردو صحافت کے اسکالر کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہاں عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مفتاح القرآن

از خدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین طع

سائز $\frac{20\times30}{8}$، حجم ۳۶ صفحات۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ۔ سنہ طباعت جون ۱۹۶۲ء ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲ء

زیر تبصرہ رسالہ گجراتی میں لکھا گیا ہے اس کے ذریعے نو عمر بچوں اور کم پڑھے بالغوں کو قرآن حکیم کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ موصوفہ نے اس سے قبل بھی اردو اور گجراتی میں ترتیل القرآن کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا جامعہ میں تعارف کیا جا چکا ہے۔ امید ہے کہ گجراتی زبان کے جاننے میں موصوفہ کی یہ کوشش کامیاب اور مقبول ہو گی۔

کوائف جامعہ

جناب حامد علی خاں صاحب کا انتقال پُرملال

جناب حامد علی خاں صاحب کا ۵ دسمبر کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۵۸ سال کی عمر میں پیرس میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی عرصے سے صحت اچھی نہیں تھی اس سے پہلے دو مرتبہ قلب پر حملے ہو چکے تھے، مگر پھر بھی جس وقت انتقال ہوا کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ انتقال کی خبر جامعہ میں حیرت کے ساتھ سنی گئی اور ہر طرف رنج و غم کی فضا چھا گئی۔ ۱۵ دسمبر کو مرحوم کی میت بذریعہ ہوائی جہاز جامعہ نگر لائی گئی۔ ہوائی جہاز بعد مغرب پالم ہوائی اڈے پر پہنچا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب، خازن جامعہ کرنل بشیر حسین زیدی اور جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کے علاوہ یونسکو کے منتظم اعلیٰ مسٹر جے سوار برک، وزارت تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری جناب آر پی نائک اور دو نمائندے شری تواری اور شری سیٹھی، مرحوم کے اعزا اور دوست احباب ہوائی اڈے پر اور دفن کے وقت موجود تھے۔

نائب صدر جمہوریہ اور امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی جامعہ نگر تشریف لائے اور نماز جنازہ میں شرکت کی۔ تابوت کے کھلنے میں کافی وقت لگا اور میت کوئی گیارہ بجے رات میں سپرد خاک کی جا سکی، مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب آخر تک موجود رہے اور دعائے مغفرت میں شرکت کرنے کے بعد واپس گئے۔

اُسی روز سہ پہر میں انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسے کی تاریخ کا ایک ماہ قبل اعلان کیا جا چکا تھا۔ جلسے میں ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع کرنے سے قبل تعزیت کی تجویز

منظور کی گئی اور ہوائی اڈے پر جانے کے لئے جلسے کو کارروائی مکمل کئے بغیر ملتوی کر دیا گیا تجویز تعزیت حسبِ ذیل ہے :-

پیرس سے یہ افسوسناک اطلاع موصول ہوئی کہ انجمن جامعہ کے حیاتی رکن جناب حامد علی خاں صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للّٰہ

موصوف نے تقریباً تیس سال جامعہ کی خدمت کی۔ آپ کی مخلصانہ کوششوں سے مکتبہ جامعہ کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اردو کی کتابوں کے گٹ اپ میں خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور یونسکو کے ذریعے جامعہ اور ملک کا نام روشن ہوا۔ موصوف کی اچانک اور بے وقت وفات سے جامعہ، اردو ادب اور یونسکو کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔

مرحوم کی اہلیہ اور ان کے لڑکوں اور لڑکیوں سے ہمیں دلی ہمدردی ہے اور ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین !

انجمن اساتذہ نے ۱۸ر دسمبر کے جلسے میں حسبِ ذیل تجویز منظور کی :-

انجمن اساتذہ کا یہ جلسہ جامعہ کے قدیم طالب علم اور اس کے حیاتی رکن انجمن اساتذہ کے ممبر اور مکتبہ جامعہ کے سابق مینجنگ ڈائرکٹر جناب حامد علی خاں صاحب کی اچانک اور بے وقت موت پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم نے تقریباً تیس سال تک جامعہ کی بے لوث خدمت کی اور اپنی اہلیت اور قابلیت کے ذریعے اردو کتابوں کی نشر و اشاعت کا معیار اونچا کیا اور ساتھ ہی ساتھ جامعہ کا نام بھی روشن کیا۔

یہ جلسہ مرحوم کے پس ماندگان سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور ان کے غم میں شریک ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

کالج میں تین اہم تقریریں

کالج کے حلقۂ مطالعہ میں جامعہ کے اساتذہ وقتاً فوقتاً مضامین پڑھتے رہتے ہیں خاص طور پر

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی زیر تصنیف کتاب ہندوستانی مسلمان — آج اور کل" کے ابواب بڑی دلچسپی اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔ ابھی حال میں موصوف نے اس کا ایک باب سیکولرزم پر پڑھ کر سنایا۔ اردو میں اس موضوع پر اتنا جامع اور عالمانہ مضمون اب تک شائع نہیں ہوا ہے لیکن اساتذہ جامعہ کے علاوہ پچھلے دنوں باہر کے تین مشاہیر نے حلقۂ مطالعہ میں تقریریں کیں جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی اور مدیر ماہنامہ "برہان" (دہلی) اسلامک اسٹڈیز کی نصاب کمیٹی کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے جامعہ تشریف لائے تھے کالج کے پرنسپل کی دعوت پر ایک پرمغز اور دلنشیں تقریر کی۔ مولانائے محترم نے اپنی تقریر میں شرعی قوانین کے شرائط، ان کے اصول اور ان کے ماٰخذ پر تفصیل سے بحث کی اور تاریخی واقعات اور مثالوں سے متعلقہ مسئلے کی پوری طرح وضاحت کی۔ تقریر کے بعد بہت سے سوالات کئے گئے۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے موضوع زیر بحث پر اظہار رائے کرتے ہوئے ان مشکلوں کی طرف توجہ دلائی جو موجودہ زمانے کے بہت سے مسائل کے سلسلے میں فقہی اجتہاد میں اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ ایسے لوگ موجود نہیں جو علوم دینی اور دنیوی کے جامع ہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جناب ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل کالج کی دعوت پر جامعہ تشریف لائے اور اپنے حالیہ دورۂ یورپ پر اختصار کے ساتھ اپنے تاثرات بیان کئے۔ فاضل مقرر نے جہاں انگریز قوم کے بلند کردار اور اس کے نظم و ضبط کی تعریف کی وہاں مغربی تہذیب کی خامیوں اور اس کی بے اعتدالیوں کی مذمت بھی کی۔

پروفیسر آغا مہدی حسین، نے "تغلق دور حکومت پر نئی روشنی" کے عنوان سے کالج کے حلقۂ مطالعہ میں ایک دلچسپ اور پر از معلومات تقریر کی۔

موصوف نے سنسکرت کے مآخذ کی مدد سے تغلق دور حکومت پر ریسرچ کی ہے۔ "رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق" (محمد بن تغلق کے عروج و زوال) کے عنوان سے ۱۹۳۵ء میں موصوف کی

پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تھا جو ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ ابھی حال میں اسی کو مزید تحقیق و تلاش کے بعد "تغلق ڈائینسٹی" (سلاطین تغلق) کے نام سے شائع کیا ہے[۱] جس میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو سلاطین تغلق اور بالخصوص محمد بن تغلق کے متعلق بہت سی تاریخی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔

پروفیسر محب الحسن صاحب نے، جن کا ابھی حال میں جامعہ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے، فاضل مقرر کے تعارف میں فرمایا کہ مہدی حسین صاحب ان چند مورخوں میں ہیں جنھوں نے ہندوستانی تاریخ پر بڑی محنت، خلوص اور دیانتداری کے ساتھ کام کیا ہے اور بہت سی تاریخی غلطیوں پر سے نقاب اٹھایا ہے۔ ہندوستانی مورخوں میں شاید ہی کسی کو اتنی زبانوں پر عبور حاصل ہو، جتنا موصوف کو حاصل ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی اور سنسکرت سے، مشرقی زبانوں میں عربی اور فارسی سے اور مغربی زبانوں میں انگریزی، فرنچ اور اطالوی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ (ع ل ا)

اُستادوں کے مدرسہ میں یوم مولانا آزاد

۸ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو شام کے چار بجے آزاد ہاؤس کی طرف سے یوم آزاد منایا گیا جلسے کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے فرمائی۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر سلامت اللہ کی تعارفی تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ ولی بخش قادری نے مولانا آزاد پر ایک مضمون پڑھا جس میں ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا جن کا تعلق مولانا آزاد کی تعلیمی سرگرمیوں سے تھا۔ اور خاص طور سے اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مولانا آزاد، آزاد ہندوستان کے تعلیمی نظام کے پہلے معمار تھے۔ اس کے بعد بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ نے مولانا آزاد کی شخصیت پر ایک مضمون پڑھا

---

[۱] انگریزی کی یہ کتاب ۲۲x۱۸ کے سائز پر ۶۰۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ متعدد سلاطین تغلق اور اہم تاریخی عمارتوں اور سکوں کی آرٹ پیپر پر تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد تیس روپے۔
ناشر:- Thacker Spink & Co. 3 Esplanade East Calcutta-1

مولانا آزاد کو صالحہ صاحبہ کے خاندان سے بہت محبت تھی اور اس کا انھوں نے وقتاً فوقتاً اظہار بھی کیا۔ اس مضمون میں اس پہلو کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ مضامین کے دوران میں دو نظمیں پڑھ کر سنائی گئیں۔ مصطفےٰ علی صاحب متعلم بی ایڈ نے اردو میں مولانا آزاد پر ایک نظم پڑھ کر سنائی اور ڈی، ایم، جولی صاحب نے انگریزی میں اپنی ایک نظم بہت ہی موثر پیرایے میں سنائی۔

آخر میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ عام طور سے جب ہم کسی شخص کو دیکھتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو تو ہم اس کی اصل صورت کو دیکھنے سے گریز کرتے ہیں اور اس کو اس طرح آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں کہ وہ صورت دیدہ زیب ہو جائے۔ اس طرح حقیقت چھپ جاتی ہے اور صحیح شکل نظر نہیں آتی۔ مولانا آزاد کو صحیح رنگ میں دیکھنے کا وہ زمانہ تھا جب وہ سیاست کے میدان میں آئے۔ وہ زمانہ ان کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ مجیب صاحب نے مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ باوجودیکہ مولانا آزاد ہندوستان کے ہر دلعزیز لوگوں میں سے تھے لیکن سیاست ہی کی وجہ سے وہ اکیلے رہ گئے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ سیاسی کارواں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تنہا رہے لیکن میرے دل پر یہ بات اس طرح نقش ہے کہ وہ اس کے بعد بھی تنہا رہے۔ دراصل یہی ان کی شان تھی۔ مولانا آزاد اپنے خاندان میں بھی تنہا رہے۔ وہ جس طرح اپنے خاندان سے الگ ہوئے وہ بھی ہمارے لئے ایک سبق ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خاندانی روایات کو ٹھیس پہنچائے بغیر حقیقت کا اظہار کیا لیکن اس طرح کہ خاندان کا لحاظ باقی رکھا۔ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن مولانا نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے مولانا کے جمالیاتی ذوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا کا جمالیاتی ذوق بہت نمایاں تھا۔ انھیں موسیقی کا شوق تھا اور اس شوق کو انھوں نے پورا بھی کیا۔ ان باتوں کی طرف ان کا ذہن بہت صاف

تھا لیکن مسلمانانِ ہند کے خیالات کو دیکھتے ہوئے وہ صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا نے اس زمانے کے حالات یا اس کے بعد کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ ایک طرح کا آئینہ ہیں۔ جن میں ہم اپنے آپ کو بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہم میں سے ہر ایک، دوسرے کے لئے آئینہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ چھوٹا آئینہ ہو چاہے بڑا، ہر آدمی اس آئینے میں اپنی زندگی تو نہیں لیکن کچھ اپنے حسن و جمال کو ضرور جانچ سکتا ہے۔

مجیب صاحب نے گاندھی جی سے مولانا کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا آزاد گاندھی جی سے اختلاف کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ انڈیا ونس فریڈم میں بہت صاف طریقے سے اس کا اظہار ہے کہ وہ گاندھی جی کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ مجھے یہ ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ آشرم میں سگریٹ پیوں لیکن مولانا آزاد گاندھی جی کی بغل میں بیٹھ کر سگریٹ پیتے تھے۔ مولانا جب بھی آشرم میں آتے تو گاندھی جی خود ہی ان کے لئے ایش ٹرے رکھوا دیتے ہنسا گاندھی جی کا خاص مسلک تھا لیکن مولانا اس سے اختلاف کرتے تھے۔ ۱۴ اگست کو ہندوستان کی آزادی کا جب اعلان ہوا تو آئین ساز اسمبلی کے تمام اراکین خوش تھے س مجمع میں صرف ایک غمگین صورت تھی اور وہ مولانا آزاد تھے۔ اس لئے کہ وہ آزادی ی اتنی قیمت نہیں دینا چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ملک قسیم کرنے پر مجبور نہیں تھے۔ یہ بات انھوں نے اپنی زبان میں کہی بھی۔ یہ بہت بڑی ہمت ا کام ہے۔

آخر میں پروفیسر مجیب نے مولانا آزاد کا پنڈت نہرو سے جو تعلق تھا اس کا ذکر رتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے وزیر اعظم کو مولانا آزاد کا بہت بڑا سہارا تھا۔ اتفاق کرنے الے بہت مل جاتے ہیں لیکن خلوص سے اختلاف کرنے والے بہت کم نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد پنڈت جی کے سچے مشیر تھے۔ وہ مسائل پر بغیر کسی بات کا خیال کئے ہوئے آزادانہ رائے دیتے تھے۔ اسی ضمن میں مجیب صاحب نے سکھوں سے مولانا آزاد کے جو تعلقات تھے

...پہنچتی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ سکھوں کو ہوا کیونکہ سکھوں
...ان پر بھروسہ تھا۔ سکھ سمجھتے تھے کہ مولانا آزاد کبھی بھی ان کے لئے بیگانہ سوچیں گے اس
...خیال کے پیچھے در اصل مولانا آزاد کی صاف بیانی تھی۔

اس موقع پر مولانا آزاد کی تصانیف اور مولانا آزاد سے متعلق کتابوں کی نمائش بھی کی
...گئی تھی۔ جناب جنید الحق صاحب، استاد ٹیچرس کالج اور محمد اشرف صاحب سکریٹری آزاد
...ڈس کی کوششوں سے یہ نمائش بہت کامیاب تھی۔ (معین الدین)

نزلے کا حملہ اور بچاؤ
نزلے کا حملہ شدید ہو یا ہلکا سخت تکلیف دہ ہوتا ہے
آنکھوں میں جلن اور حرارت ناک اور گلے میں خراش
سر اور پورے جسم میں درد اور طبیعت مضمحل ہو تو یقیناً
آپ پر نزلہ کا حملہ ہو گیا ہے۔ ان تمام حالتوں میں
شربت نزلہ ایک بہترین دوا ہے
یہ گل بنفشہ، کشمیری اور دوسرے مفید
اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے؛ ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا رہی ہیں
دواخانہ طبیہ کالج۔ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ (یو پی)
ایجنٹ اور اسٹاکسٹ
(۱) حکیم پور کھیری۔ بھارتی دواخانہ (۲) ہردوئی۔ دواخانہ معین الصحت، صدر بازار (۳) مالیگاؤں ناسک۔ نیشنل میڈیکل اسٹور تلک بازار (۴) ناگپور۔ پولیس لائن روڈ (۵) پوری (گڑھوال) حکیم فضل حسین اپر بازار۔
شاعر کی چونتیس سالہ ناقابلِ فراموش ادبی روایات کے بعد وسطِ جنوری میں اس کی
۳۵ ویں سالگرہ پر پھر پیش کیا جا رہا ہے
سالنامہ سنہ ۱۹۶۴ء
شعر و ادب اور افسانہ و ڈرامہ کا حسین و جمیل مرقع۔
مشاہیر اہلِ قلم کی تازہ نگارشات
جدید آرٹ کا ایک یادگار سلسلہ مع تصاویر، تنقید و تحقیق اور طنز و مزاح کا بیش قیمت مواد
مشاہیر کے چند پرانے خطوط انہی کے اندازِ تحریر میں اور کئی دوسرے علمی و ادبی جواہر پارے
خوب صورت رنگین سرورق ۱۱۴ صفحات قیمت صرف ایک روپیہ
منیجر ماہنامہ "شاعر" مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ بمبئی ۸
طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی
مطبوعہ: یونین پریس دہلی
ٹائٹل: دیال پریس دہلی

مستشرقین کی بین اقوامی کانگریس نمبر

جامعہ

جلد ۵۰ | بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۶۴ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس

جناب ضیاء الحسن فاروقی

امسال ۴ جنوری ۱۹۶۴ء سے ۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء تک مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا چھبیسواں اجلاس وگیان بھون، نئی دہلی، میں منعقد ہوا، عالموں کے اس اجتماع میں ۴۹ ملکوں کے ۱۳۱۸ مشاہیر شریک ہوئے۔ ان کی تقسیم حسب ذیل تھی:

ڈیلیگیٹ ۱۰۹۴

ایسوشی ایٹ ممبر ۱۴۴

آبزرور ۸۰

اس موقع پر مختلف سیکشن میں کوئی آٹھ سو مقالے پیش ہوئے، ان میں بعض ایسے بھی تھے جو نہیں پڑھے گئے کیونکہ ان کے مصنف کسی وجہ سے کانگریس میں شریک نہیں ہو سکے یا اس وقت موجود نہیں تھے جب اُن کے پڑھنے کی باری آئی، کانگرس کو دس حصوں یا سیکشنز میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور مقالوں کی تقسیم بھی عنوانات کے پیش نظر دس حصوں میں کی گئی تھی، ان کی تقسیم اس طرح تھی:

۱۔ مصریات (Egyptology)

۲۔ سامی علوم (Semitic Studies)

۳۔ حطی اور کاکیشیائی علوم (Hittite and Caucasian Studies)

۴۔ الطائی علوم و ترکیات (Altaic Studies Including Turcology)

۵۔ ایرانی علوم (Iranian Studies)

۶- انڈولوجی (INDOLOGY)

ا۔ ویدک علوم اور سندھی تہذیب

ب۔ کلاسیکی سنسکرت

ج۔ مذہب وفلسفہ

د۔ تاریخ وتہذیب

ہ۔ جدید ہندوستانی زبانیں اور زبانوں کا تقابلی مطالعہ

۷۔ علوم متعلق بہ جنوب مشرقی ایشیا (SOUTH-EAST ASIAN STUDIES)

۸۔ علوم متعلق بہ مشرقی ایشیا (EAST ASIAN STUDIES)

۹۔ علوم اسلامیہ (ISLAMIC STUDIES)

۱۰۔ علوم افریقیہ (AFRICAN STUDIES)

مقالے اچھے بھی تھے اور بُرے بھی، نمایندوں کا خیال تھا کہ مقالوں کی کثرت کی وجہ سے بحث ومباحثہ کے لئے کافی وقت نہیں ملا، ایسے اجتماعات میں بحث مباحثہ اور تبادلِ خیالات کے بغیر کسی کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا، نہ تو مقالہ پڑھنے والوں کو اور نہ سننے والوں کو کسی زیر بحث موضوع پر جب تک مختلف زاویوں سے روشنی نہ ڈالی جائے اور قاری وسامع میں علمی لین دین کا کوئی موقع نہ ہو تو بات یک طرفہ رہ جاتی ہے اور موضوع تشنہ، اس لئے نمایندوں کا عام رجحان یہ تھا کہ مقالوں اور مقالہ نگاروں کو پہلے جانچ لینا چاہیئے کہ مقالوں کا کیا معیار ہے اور مقالہ نگار کس حیثیت کے ہیں، چنانچہ کانگریس کے عام اجلاس میں بھی یہ بات کہی گئی لیکن بعض نمائندے اس کی موافقت میں نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ اس صورت میں جانبداری کا اندیشہ ہے اور بعض اچھے اور معیاری مقالے نظریاتی تعصب کا شکار ہو سکتے ہیں اس لئے اجلاس عام میں اس پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا اور یہ معاملہ مشاورتی کمیٹی کو سونپ دیا گیا۔

کانگریس کے جو دس شیکشنز تھے ان کی صدارت کا بارگراں ان غیر ملکی عالموں کے کاندھوں پر ڈالا گیا تھا جو اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، اِن کے ساتھ ایک ایک سکریٹری بھی تھا اور یہ سب ہندوستانی تھے، اس انتظام سے کافی سہولت رہی اس موقع پر دو سمپوزیم بھی ہوئے، ایک کا عنوان تھا۔ 'ROLE OF ORIENTAL STUDIES IN THE HUMANITIES'

اس کی صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی اور شری اے، گھوش نے سکریٹری کے فرائض انجام دئے، اس سمپوزیم میں پروفیسر سونتی کمار چیٹرجی، پروفیسر فلیوزاٹ، پروفیسر بشیم اور پروفیسر نارمن براؤن، خاص مقرر تھے، مقصد یہ تھا کہ مذہبیات، ادبیات، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی تعلیم کے سلسلے میں علوم مشرقیہ کی حیثیت متعین کی جائے، ادھر کچھ عرصے سے سوویٹ یونین اور امریکہ کو چھوڑ کر مغربی دنیا میں علوم شرقیہ سے دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے اور یہ صورت حال افسوسناک ہے، آج اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ ایشیائی ملکوں کی تاریخ، جغرافیہ، ادب، مذہب، آرٹ اور کلچر کا مطالعہ کیا جائے ورنہ مغربی تہذیب مفلس ہو کر رہ جائے گی، عالمی تاریخ کا مطالعہ اس طرح ہونا چاہیئے کہ دنیا کی تمام قوموں نے اپنی استطاعت کے مطابق انسانی تہذیب کی ترقی میں حصہ لیا ہے، تمام تہذیبوں نے ماضی سے استفادہ کیا ہے، آج کے انسان کو خواہ اُس کا تعلق مغرب سے ہو یا مشرق سے، اس تاریخی حقیقت سے واقف ہونا چاہیئے ورنہ وہ عہد جدید کو نہیں سمجھ سکتا، ایشیائی ملکوں میں جب یورپین اقوام کا سیاسی اثر پھیلا تو انھوں نے مشرق کی مختلف تہذیبوں، ادبیات فلسفہ اور فنون کا مطالعہ شروع کیا اور مغرب کو اس بات سے آگاہ کیا کہ مشرق میں حسن اور علم کی کیسی کیسی دنیائیں ہیں، اس سلسلہ میں مغربی عالموں نے بڑی جد و جہد کی اور اپنی عمریں کھپا دیں، یہاں تک کہ ایک حد تک مشرق کو بھی اپنے تہذیبی خزانے کا علم انھیں کی بدولت ہوا، لیکن اس سب کے باوجود ابھی تک وہ آدرش جو مشرق کی تہذیبوں کی جان ہیں مغرب کی ذہنی دنیا میں اپنا مناسب مقام نہیں حاصل کر سکے ہیں، انسانیت ایک ہے، مسلک انسانیت ایک ہے، اس لئے انسان کی علمی، فنی اور تہذیبی دولت بھی ساری انسانیت کی

مشترک میراث ہے، اس لئے مغرب اور مشرق کی تمام قوموں کو ایک دوسرے کا احسان مند ہونا چاہیئے مشرقی علوم مغرب کے تعلیمی اداروں میں پڑھے جائیں اور مغربی علوم مشرق کی درسگاہوں کے نصاب کا لازمی جزو بن جائیں، انسانی اقدار اور بین الاقوامی مفاہمت کے شریفانہ جذبے کو اسی طرح تقویت بخشی جا سکتی ہے۔

دوسرا سیموزیم CHANGES IN MUSLIM PERSONAL LAW کے موضوع پر تھا، اس کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلہ تھے اور سکریٹری پروفیسر محمد مجیب، اس کے خاص مقررین حسبِ ذیل تھے :-

(۱) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (علی گڑھ)
(۲) ہز ایکسیلنسی مسٹر سیف اللہ اسین (سفیر ترکی)
(۳) ہز ایکسیلنسی مسٹر احمد حسن الفقیہہ (سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)
(۴) مسٹر میر اقبال حسین (بنگلور)
(۵) پروفیسر سید حسین نصر (ایران)
(۶) پروفیسر اینڈرسن (لندن)

جناب صدر نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں اس کی وضاحت کی کہ زیر بحث موضوع کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے ہے، لہٰذا یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ پرسنل لا، کی کیا حدود ہیں، اُن معاملات کے علاوہ جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی عقیدہ اور اس کے متعلقہ اعمال سے ہے، فرد کی زندگی کے ہر مسئلہ کا اثر سماج اور ریاست پر پڑتا ہے، ہندوستان سیکولر ریاست ہے اس لئے ان قوانین پر کسی کمیونٹی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے جو فلاح عامہ کے پیش نظر وضع کئے جائیں، ایسے قوانین اور عدالتی فیصلے پہلے ہی سے موجود ہیں جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے، اس لئے یہ نقطہ نظر کہ یہ پرسنل لا مقدس ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، صحیح نہیں ہے، آخر میں انہوں

نے کہا کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ذاتی عقیدہ سے ہے، اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونا چاہیئے، باقی اور معاملات میں پارلیمنٹ کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ مجموعی طور پر قوم کے حق میں کیا چیز مفید ہے۔

مولانا اکبرآبادی نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ شریعتیں بدلتی رہی ہیں۔ انھوں نے امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے نقل کی کہ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہے وہ شریعت کے معاملات میں رائے دینے کا اہل نہیں، انھوں نے منصوص اور غیر منصوص کے فرق کو بھی واضح کیا اور اس کی تائید کی کہ غیر منصوص معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو، مولانا کی یہ رائے تھی کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اپنے اپنے ملک میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلیوں کا ذکر کیا، سفیر ترکی نے کہا کہ حالات کے ساتھ یہ تبدیلیاں آئیں، ترکی کی نیشنل اسمبلی کی رائے کی وہی حیثیت قرار پائی جو اجماع کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ قرآنی تعلیمات اور انصاف ومساوات کے اصولوں کے مطابق ہوئی ہیں۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں پرسنل لا سے متعلق جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ قرآن وسنت کے مطابق ہیں، ہم لوگوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور شیعہ امامیہ فقہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور فلاح عامہ کے اصول کے تحت جہاں جو بات معقول ملی اسے لے لیا، انھوں نے اس کی کئی مثالیں دیں اور ثابت کیا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ شریعت کے حدود میں ہیں۔ میر اقبال حسین نے پورے طور پر انصاف واستحسان کے اصول پر تبدیلی کی حمایت کی، سید حسین نصر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ مسلم پرسنل لا میں ہم جن تبدیلیوں کے خواہاں ہیں وہ کہیں اس لئے تو نہیں ہیں کہ ہم مغرب سے مرعوب ہیں اور اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، س کا عام چرچا ہے کہ قانون کو زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیئے، اگر یہ بات ہے تو پھر زمانہ کس کے ساتھ چلے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کیا اصول ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے، اسلام میں کوئی لا پرسنل لا نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام افراد اور سماج میں کوئی فرق نہیں کرتا، یہ بات

عیسائیت کے لئے تو آسان تھی کہ وہ جب چاہے اپنے لئے قانون وضع کرے کیونکہ عیسائی مذہب میں شریعت کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن اسلام کے لئے یہ اتنا سہل نہیں ہے۔ پروفیسر اینڈرسن نے پروفیسر نصر کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اور اسلامی ملکوں کے قوانین میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اُن پر بڑی تصریح کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس کی حمایت کی کہ فلاح عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ملکوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

کانگرس کے آخری عام اجلاس میں اس کا اعلان ہوا کہ کانگرس کا آئندہ اجلاس امریکہ میں ہوگا۔ کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا اجلاس ایشیا میں ہوا، اور ایشیا کے اس ملک میں ہوا جو عہد عتیق ہی سے ایک خاص طرز زندگی اور نمایاں تہذیب کا حامل رہا ہے کانگرس میں یہ بات کہی گئی کہ اگرچہ اس موقع پر کوئی دور آفریں دریافت پیش نہیں کی گئی لیکن اس اجتماع سے بہت فائدے ہوئے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے خیالات پیش کرنے اور تبادلۂ خیالات کا پورا موقع نصیب ہوا، کسی قسم کی پابندی اور حوصلہ شکنی نہیں ہوئی۔ امسال پہلے کے مقابلے میں زیادہ نمایندے شریک ہوئے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا کی توجہ ان ملکوں اور علاقوں کی طرف ہے جو قدیم تہذیبوں کے گہوارے رہ چکے ہیں اور جہاں آج ایک نئی زندگی پروان چڑھ رہی ہے، یہ زمانہ تخصص کا ہے اور علم کے مختلف شعبوں اور مختلف علاقوں اور تہذیبوں سے متعلق محققین کے اس اجتماع کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے میدان تخصص سے باہر دوسرے علمی افق کے مناظر سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، کچھ نئے محققین ہیں انھیں اپنے مضمون کے اُن ماہرین سے ملنے اور ان کے علم و تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، نئی راہیں ان کے سامنے کھلتی ہیں، سوچنے کے نئے طریقوں سے ان کی واقفیت ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں ان کے سمند شوق کے لئے تازیانہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے اور نظم و نسق کے نقطۂ نظر سے — غرض کسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیے تو نئی دہلی میں مستشرقین کا بین الاقوامی اجتماع بہت کامیاب رہا۔

کانگریس کے کئی سیکشنز میں میں نے مقالے سنے اور مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے یہاں مجموعی طور پر علم و فضل اور تحقیق و تلاش کا جو معیار ہے وہ ابھی عرصہ تک مغرب کے عالموں کے معیار تک نہیں پہنچ سکتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں علمی کام کی جو گراں قدر روایات قائم ہو چکی ہیں ان کے پیچھے ایک دور گزر چکا ہے، علم اور تجربہ، مسلسل محنت اور مستقل شوق کا ایک سلسلہ ہے جو ایک عرصہ میں قائم ہوتا ہے، پھر مغربی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں کے پاس جو وسائل ہیں وہ وافر ہیں، ان وسائل کو وہاں دیانتداری سے برتا جاتا ہے، ہمارے یہاں صورتِ حال مختلف ہے، اس لئے کہ ہماری تاریخ مختلف رہی ہے، ذہین لوگوں کی یہاں کمی نہیں ہے لیکن تنظیم نہیں، دیانتداری نہیں، محنت اور شوق کا وہ معیار نہیں، اس لئے ٹھوس علمی روایات کے قائم ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔

کانگریس کی مختصر تاریخ

یہ تخیل کہ مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگریس قائم کی جائے، فرانس کے متبحر عالم پروفیسر لیون ڈی روزنی (LEON DEROSNY) کا تھا، چنانچہ پہلی کانگریس کا انعقاد اسی کی صدارت میں ۱۸۷۳ء میں ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد اسی وقت پڑ چکی تھی جب ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی تھی، سر ولیم جونس فارسی، عربی اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور مغربی دنیا کے ان افراد میں سے تھے جو ہیومانزم کے شیدائی تھے اور مشرق کی زبانوں اور ادبیات کے فدائی، وہ اپنے ہم عصروں میں اس بات کا سب سے زیادہ احساس رکھتے تھے کہ مشرقی علوم کا خزانہ بہت وسیع ہے اور مشرقی تہذیبوں کی خصوصیات گوناگوں، یورپ جس کے تعلقات مشرق سے بڑھ رہے ہیں، اگر ان تہذیبوں کو نہ سمجھ سکا تو یہ تعلقات سطحی ہوں گے اور ان کی بنیاد محض مادیت پر ہوگی، ذہنی و روحانی روابط قائم نہیں ہوں گے اور اس سے یورپ ہی کو نقصان پہنچے گا۔ اس طرح ایشیاٹک سوسائٹی جس کا مقصد ایشیا کے علوم

ادبیات، فنون، آثار اور تاریخ کے متعلق تحقیق و تلاش" تھا، ایک ایسا ادارہ تھا جس نے اہل یورپ کی توجہ اس اہم کام کی طرف مبذول کی اور پھر اس کے بعد انیسویں صدی کے نصف اول میں یورپ میں کئی ادارے اس طرز کے قائم ہوئے۔ مثلاً روس کی ایشیاٹک اکادمی (۱۸۱۰ء)، پیرس کی SOCIETE ASIATIQUE (۱۸۲۲ء) اور لندن کی روائل ایشیاٹک سوسائٹی (۱۸۲۹ء) وغیرہ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے قیام کے بعد یورپ کی دلچسپی علوم شرقیہ میں بڑھی اور ایران، عراق، مصر اور ہندوستان کے متعلق نئے اور عظیم انکشافات ہوئے، اسی دوران اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان طلبا، ادبا معلمین کے لئے جو مختلف ملکوں میں مشرقی تہذیبوں سے متعلق علمی کاوشوں میں مصروف ہیں، باہم مل کر بیٹھنے کا کوئی انتظام ہو تو اس سے مفید نتائج برآمد ہوں گے، سب ایک دوسرے کے کام سے باخبر رہیں گے، تحقیق و تدقیق کے لئے نئی راہیں سامنے آئیں گی اور علمی لین دین کی ایسی فضا قائم ہوگی کہ علوم شرقیہ کے کاز کو تقویت ملے گی، یہی وہ طرز فکر تھا جس نے اس کانگرس کو جنم دیا اور اس کا سہرا اُسی فرانسیسی عالم کے سر ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس پر کڑا وقت بھی گزرا اور لوگوں نے اس کی افادیت پر شبہ کیا، لیکن ہم شکر گذار ہیں میکس مُلر (MAX MULLER) اور دوسرے مستشرقین کے جنھوں نے اس کو ختم ہونے سے بچایا اور اپنی شخصیت اور دانش مندی سے اس کے مقاصد کی ایسی وضاحت کی کہ آج تک یہ نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی وجہ سے اورینٹل اسٹڈیز کے کام کو بڑا سہارا اور بڑی ترقی ملی ہے کانگرس نے اب تک جو تجویزیں پاس کی ہیں، اس کے مختلف سیکشنز میں جو مقالے پڑھے گئے ہیں، اور اس کی حوصلہ افزائی کے سبب مشرقی علوم و فنون اور تاریخ و ادبیات کا جو ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان سے اس کے کارناموں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میکس مُلر نے ایک موقع پر کہا تھا:-

"ہمارے مقالوں کو دیکھئے اور ہماری بحثوں اور تبادلۂ خیالات کے طریقے پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح اورینٹل اسکالرشپ کے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے

کہ ہماری کانگرس علوم شرقیہ کی تدوین و ترقی کی راہ میں دور آفریں ثابت ہوگی، کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں ہم نے جو نکات دینے والی باتیں بتائی ہیں، ہم نے ثابت کیا ہے کہ ہم میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ہم اپنے مخالفوں کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔"

شروع ہی میں کانگرس نے اپنے لئے کچھ قاعدے بنالئے تھے، کچھ ضابطے مقرر کر لئے تھے، اور آج تک انھیں کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ کانگرس کے سامنے ایک مسئلہ یہ تھا کہ اس کی زبان کیا ہو، پہلی کانگرس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ کانفرنس میں صرف دو زبانوں کا استعمال ہوگا، ایک فرانسیسی ہوگی اور دوسری اس ملک کی زبان ہوگی جہاں کانگرس کا اجلاس ہوگا لیکن بعد میں اس سے دشواریاں پیدا ہوئیں اور یہ طے ہوا کہ جس کسی کا جس زبان میں جی چاہے اظہار خیال کرے، لیکن اب عام طور پر تین زبانیں ـــــ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ـ استعمال کی جاتی ہیں، ویسے کسی زبان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ پہلے عورتیں کانگرس کے اجلاسوں میں شریک نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اب یہ حق انھیں بھی مل گیا ہے اور وہ بھی اس میں شرکت کرتی ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کانگرس میں مختلف سیکشنز ہوتے ہیں اور شروع ہی سے یہ اصول رہا ہے کہ ہر سیکشن کی صدارت ایک ایسا عالم کرتا ہے جو اس سیکشن کے موضوع پر عالم گیر شہرت کا حامل ہوتا ہے۔

پہلے مصریات، اسلامی علوم اور دوسرے موضوعات کے تحت افریقیہ پر بھی گراں قدر مقالے پڑھے جاتے تھے اور ان کی وجہ سے علوم افریقیہ سے متعلق علمی کاوشوں کی ایک روایت قائم ہو چکی تھی، لیکن اب جب کہ افریقیہ بیدار ہو گیا ہے، افریقی اقوام اپنے ماضی سے واقف ہونے کے لئے بے چین اور مستعد ہیں اور افریقیہ کی تاریخ، تہذیب اور فنون پر کام کرنے والوں نے اپنی الگ کانگرس بنالی ہے، تو مستشرقین کی کانگرس نے بھی ۱۹۶۰ء میں اپنے ماسکو کے اجلاس میں یہ طے کیا ہے کہ اس کا ایک سیکشن علوم افریقیہ سے بھی متعلق ہوگا، دونوں علمی انجمنیں ہیں اس لئے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں مستشرقین کی کانگرس کا یہ سیکشن افریقیہ اور ایشیا

کے مابین ایک رابطہ کا کام دے گا۔

اب تک کانگرس کے چھبیس اجلاس ہو چکے ہیں، عام طور پر دو یا تین سال کے بعد اس کے اجلاسات ہوتے رہتے ہیں علاوہ دو عالم گیر لڑائیوں کے زمانے کے جب یہ وقفہ طویل ہو گیا تھا، اس کو قائم ہوئے نوے سال (۱۸۷۳ - ۱۹۶۳ء) ہو چکے اور اس عرصہ میں اس نے نہ صرف مغربی دنیا کو مشرق کے علمی، فنی اور تہذیبی کارناموں سے روشناس کرایا بلکہ اس کے پلیٹ فارم پر مشرق کے عالموں نے بھی اپنی تاریخ اور تہذیب سے آگاہی حاصل کی، اس کی کاوشوں کے طفیل ہیومانزم (HUMANISM) کی قدروں کو سہارا ملا، اور آج جب دنیا کی قومیں ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں، اس کے سہارے ایک عالمی تہذیب کے نصب العین کو بڑی تقویت مل سکتی ہے۔

ذیل کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گا کہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کب اور کہاں ہوئی اور اس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کن لوگوں نے کی :-

(۱) ستمبر ۱۸۷۳ء، پیرس، پروفیسر لیون ڈی روزنی

(۲) ستمبر ۱۸۷۴ء، لندن، ڈاکٹر سیموئل برچ۔

(۳) ستمبر ۱۸۷۶ء، سینٹ پیٹرس برگ، کاونٹ ورن زوف، صدر منتخب ہوئے لیکن شریک نہ ہو سکے۔

(۴) ستمبر ۱۸۷۸ء، فلورنس، کوئی صدر نہیں تھا، اور ہر سیکشن نے اپنے طور پر کام کیا۔

(۵) ستمبر ۱۸۸۱ء، برلن، ڈاکٹر ڈلمن

(۶) ستمبر ۱۸۸۳ء، لیڈن، پروفیسر کوئنن

(۷) ستمبر - اکتوبر ۱۸۸۶ء، وی انا، بیرن قان کریمر

(۸) ستمبر ۱۸۸۹ء، اسٹاک ہوم (سویڈن) اور کرسچیانا (ناروے)، کوئی صدر نہیں تھا۔

(۹) ستمبر ۱۸۹۲ء، لندن، کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۰) ستمبر ۱۸۹۴ء، جنیوا، کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۱) ستمبر ۱۸۹۷ء، پیرس، پروفیسر شیفر
(۱۲) ۱۸۹۹ء، روم، کوئی صدر نہیں تھا۔
(۱۳) ستمبر ۱۹۰۲ء، ہمبرگ
(۱۴) ۱۹۰۵ء، الجیرز
(۱۵) اگست ۱۹۰۸ء، کوپن ہیگن
(۱۶) اپریل ۱۹۱۲ء، ایتھنز، کاؤنٹ انجیلو ڈی گوبرنیٹس
(۱۷) اگست ستمبر ۱۹۲۸ء، آکسفورڈ، لارڈ شیلمرس
(۱۸) ستمبر ۱۹۳۱ء، لندن، پروفیسر سی، سنوک ہرونجے
(۱۹) ستمبر ۱۹۳۵ء، روم، پروفیسر پاؤلو امیلیو پاولنی
(۲۰) ستمبر ۱۹۳۸ء، برسلز، پروفیسر جین کپارت
(۲۱) جولائی ۱۹۴۸ء، پیرس
(۲۲) ستمبر ۱۹۵۱ء، استنبول، پروفیسر ذکی ولیدی توغان
(۲۳) اگست ۱۹۵۴ء، کیمبرج، پروفیسر سر الف، ایل، ٹرنر
(۲۴) اگست ستمبر ۱۹۵۷ء، میونخ، پروفیسر ارنسٹ واشمت
(۲۵) اگست ۱۹۶۰ء، ماسکو، پروفیسر بی غفوروف
(۲۶) جنوری ۱۹۶۴ء، نئی دہلی، پروفیسر ہمایوں کبیر

خطبوں کے خلاصے

تلخیص و ترجمہ: جناب عبداللہ ولی بخش قادری

مستشرقین کی کانگریس میں تین خطبے پڑھے گئے تھے، پہلا خطبہ، پچھلے اجلاس کے صدر ڈاکٹر غفوروف کا تھا، اس کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کا افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا گیا۔ موصوف اپنی علالت کی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے تھے، اس لئے پروفیسر ہمایوں کبیر نے ان کا خطبہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر جلسہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا۔ ان تینوں خطبوں کے اہم نکات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

ڈاکٹر غفوروف، سابق صدر کانگریس

مستشرقین کی پچیسویں کانگریس ایک طویل عرصے تک یاد رہے گی۔ ماسکو کی اس کانگریس میں نمایاں حیثیت مشرق ہی کو حاصل تھی، وہ مشرق جو اپنے وجود سے آشنا ہو رہا ہے، وہ مشرق جو اپنے آپ کو سمجھنے لگا ہے، وہ مشرق جس نے ابھی ابھی نوآبادیاتی نظام کی بیڑیوں سے نجات حاصل کی ہے اور جو نئی زندگی کی شاہراہ تعمیر پر گامزن ہے، ایسی زندگی پر جو سیاسی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے خود مختار ہے۔

مستشرقین کے گذشتہ جلسوں کی اچھی روایات یعنی تمام ملکوں کے اسکالروں کا جذبۂ تعاون، صلح و آشتی اور دوستانہ تعلقات کا جوش و خروش، جس کا اظہار بہت نمایاں طور پر ماسکو کی کانگریس میں کیا گیا تھا، برابر جاری ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ مفید سلسلہ دہلی میں قائم رہے گا۔

گذشتہ چند برسوں میں علمی دنیا میں جو قابل ذکر انکشافات ہوئے، ان میں سنسکرت زبان کے وہ مخطوطے بھی ہیں جو سوویٹ سنٹرل ایشیائی جمہوریتوں میں برج کی چھال پر لکھے ہوئے ہیں۔ ان مخطوطات کا تجزیہ کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ عہد وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی لین دین رہا تھا۔ سوویٹ اسکالر ان دستاویزوں کی نقلیں اپنے ہندوستانی ساتھیوں کو ہدیۃً پیش کر رہے ہیں اور اس کی امید کرتے ہیں کہ مشترک مطالعہ

اس اہم مسئلے کی بھرپور چھان بین اور مکمل تحقیق کی جائے گی۔

مشرق کا مطالعہ، جس کے لئے ہم نے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں، اس دور میں روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ مشرقی علوم کو انسان دوستی کے نصب العین سے فیضان حاصل کرنا چاہیئے اور ترقی اور امن کے مقاصد کو پورا کرنا چاہیئے، ہمارا ہر عمل جارحانہ وطن پرستی اور تنگ قومیت کے احساسات سے، جس کی بعض جگہوں پر مثالیں ملتی ہیں، بالکل پاک ہونا چاہیئے۔ مشرق کے عوام کی تاریخ اور تہذیب کے مطالعہ کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ان لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے نہ کہ ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

ہم اسکالروں سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم جنگ کے خلاف اور امن کی خاطر، ایٹمی اور ہائیڈروجن بموں کے مقابلے میں ترک اسلحہ کے لئے، فوجی تیاریوں کی مخالفت اور پرامن اشتراک عمل کی حمایت میں، وحشیانہ نسلی تعصبات کے نظریوں کے بجائے انسان دوستی کے لئے، جہالت کے خلاف تہذیب کی خاطر، نوآبادیاتی استبداد کے خلاف آزادی کے لئے، نسلی امتیازات، جارحانہ وطن پرستی اور ہر قسم کے سماجی اور قومی ظلم و جور کے خلاف اور عوامی مساوات کے لئے لڑیں گے۔
اس سلسلے میں مشرق کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کے الفاظ میں میں عرض کروں گا۔

درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل بیار آرد
نہالِ دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

ترجمہ:۔ دوستی کا درخت لگا، تا کہ دل کا مقصد پھل لائے۔ دشمنی کا پودا اکھاڑ پھینک، کیونکہ بے شمار تکلیفیں دیتا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن ، صدر جمہوریۂ ہند

یہ کانگریس جتنے سکشن میں تقسیم کی گئی ہے اور ان سکشن میں جن موضوعات پر تبادلہ خیال کیا جائے گا وہ مصر، بابل، شام، ایران، اسرائیل، مغربی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیا میں پروان چڑھنے والی تہذیبوں کے ایک وسیع میدان کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ان تہذیبوں کا عطیہ آج انسان کی

میراث ہے۔ اگرچہ ان سب میں ادبی، فلسفیانہ، جمالیاتی اور مذہبی اسالیب موجود تھے لیکن ان میں سے بعض کسی مخصوص تہذیب میں بعض سے نمایاں ہو گئے۔

آج دنیا کے تمام انسان سائنس کی ایجادات اور صنعت و حرفت کی کارگزاریوں کی بدولت ایک قریبی پڑوس بن گئے ہیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کا نتیجہ تہذیبوں، قوموں اور مذہبوں کے میل ملاپ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ موجودہ صورت میں ہم جو نظریہ قائم کر سکتے ہیں وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے کی خواہش نہیں ہے بلکہ وسیع الخیالی کا رجحان ہے۔ وہ عدم رواداری نہیں بلکہ مفاہمت کا، وہ نفرت اور تشدد کا نہیں بلکہ قدر شناسی اور اپنے اندر سمو لینے کا رجحان ہے۔

آج دنیا ایک ایسی عالمی برادری کی تشکیل کی خواہش مند ہے، جس میں اتحاد اور یکجہتی ہو نہ کہ اتحاد و اتفاق پر مبنی عالمی برادری کی یکسانیت اور ہم خیالی۔ ہمیں عظیم معلمین عالم کے ارشادات یاد رکھنے چاہئیں کہ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ اور ان کے آپسی امتیازات کو فنا نہیں کر دینا ہے بلکہ ان کو باہمی مفاہمت کے ذریعے قائم و برقرار رکھنا ہے۔ ہمیں دوسروں کے تجربات اور معتقدات سے سیکھنا چاہیئے۔ ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ قوموں کے مابین نزاع کا تصفیہ جنگیں نہیں ہو سکتیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی تباہ کن ہوتی ہیں۔ موجودہ جنگ میں نہ کوئی کچھ پاتا ہے نہ کھوتا ہے۔ نہ کوئی فاتح ہوتا ہے اور نہ کوئی مفتوح۔ اختلافات کو انسانی فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کی واقفیت کی وسیع سطح پر ختم کر دینا چاہیئے۔ ہم دنیا کا خاتمہ اپنے نظریات کے مجنونانہ جوش یا نہایت ہی سخت سیاسی حماقت میں ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں تمام بنی نوع انسان کے وفادار رہنے کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ کلیتاً ایک قوم یا جماعت یا مذہب کی وفاداری موجودہ دنیا میں کافی نہیں ہے۔

آپ حضرات جو فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ، اور دنیا کی مختلف تہذیبوں کے کھوج لگانے والے ہیں، انسانوں کے دل و دماغ کی تعمیر میں سیاسی رہنماؤں سے بھی زیادہ قطعی آواز رکھتے ہیں۔ آئیے آج ہم علم و فضل کے جذبے کے تحت جو حد و دسے نا آشنا ہے اور جو اگر حقیقی ہو تو انکساری

اور ضبط پیدا کرتا ہے، اپنے آپ کو وقف کر دیں ایک نئی دنیا کے تعمیر کے لئے اپنے اندر سے نفرت، تعصب اور ہر قسم کے تشدد کا شائبہ تک مٹانے کے لئے۔ آیئے ہم ایک ایسی منزل کی طرف چلیں، جہاں ہر نسل، ہر تہذیب اور ہر ملک کی قدر کی جاتی ہے۔ دنیا دوستی کی طلب گار ہے، اس سرزمین کی آثار رگ وید کے زمانے سے لے کر آج تک ہم سے مشترک نصب العین اور مقاصد کی آبیاری کے لئے دوش بدوش بڑھنے کے لئے کہتی رہی ہے۔

پروفیسر ہمایوں کبیر، موجودہ صدر کانگریس

یہ پہلا موقع ہے کہ کانگریس کا اجلاس یورپ کے باہر ہو رہا ہے اور غالباً یہ نہایت مناسب ہے کہ یہ جلاس ہندوستان میں ہو جو زمانۂ ماقبل تاریخ سے بہت سے تمدنوں اور تہذیبوں کا سنگم رہا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ اس کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہندوستان اور مشرق و مغرب کے دور دراز ملکوں میں تعلقات تھے۔ انسانیت کے ماہرین اس کی شہادت بھی پیش کرتے ہیں کہ مغربی حصے کے تصورات اور مشرقی علاقوں کے فنون نے ایک دوسرے سے مل کر ہندوستانی تہذیب کو زمانۂ ماقبل تاریخ میں بھی ایک زرق برق اور بوقلموں تار و پود عطا کر دیا تھا۔ ادب ان شہادتوں سے بھرا پڑا ہے کہ ہندوستان کے اندر و باہر افراد اور حالات کی آمد و رفت زمانۂ ماقبل تاریخ کی دھندلی گذرگاہوں سے ہوتی رہی ہے۔

اس کرۂ زمین کے مشرق و مغرب کے مادی لین دین سے قطع نظر دنیا کے مختلف حصوں میں قدیم زمانے سے آپس کا نظریاتی اور تہذیبی ربط ضبط کا گہرا اور دور رس سلسلہ جاری ہے۔ حروف تہجی کی ایجاد فنیقیوں نے کی جہاں موجودہ لبنان ہے لیکن بہت جلد وہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اقلیدس کی بنیاد مصر نے ڈالی ہو لیکن وہ آناً فاناً انسان کی مشترک میراث بن گئی۔ صفر کا تصور اور اعشاریہ کا طریقہ ہندوستانیوں کا استنباط ہے ساری مہذب دنیا ان کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ کاغذ شاید چینیوں کی دین ہے۔ لیکن آج علم کی ہر منزل پر دنیا کے تمام ممالک میں کاغذ ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک یقینی بات کسی بھی ملک کے اندر کسی بھی عہد میں کسی بھی تہذیب کے متعلق یہی ہے کہ اس کی قوت نمو اور تازگی کے مختلف سرچشمے رہے ہیں اور اس نے اپنے موقع پر بعد کے زمانے میں مختلف ممالک کے اندر ابھرنے والی نئی تہذیبوں کو اپنی دولت سے مالامال کیا ہے۔

شرعی قانون کی تبدیلی

پروفیسر محمد مجیب

زندگی کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے قانون کا سہارا چاہیئے۔ یہ عالموں کا مانا ہوا ایک اصول ہی نہیں ہے، اس کے بغیر واقعی سماجی زندگی میں کوئی استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن تاریخ اس کی شاہد ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور قانون میں اسی رفتار سے ترمیم نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس لئے کہ تبدیلی کے بارے میں یقین اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد کافی ہو جائے اور قانون کے نہ بدلنے سے جو نقصان ہو رہا ہو، وہ ثابت کیا جا سکے۔ یہ ہے ان قوانین کا مسئلہ جو حکومتِ وقت کی تحریک پر یا اس کے توسط سے یا اس کے حکم سے بنتے ہوں۔ اگر قانون کی بنیاد دینی عقائد پر ہو اور اس کی سند دینی کتابوں سے دی جاتی ہو تو معاملہ اور مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ عقائد کی طرح عقائد پر منحصر قوانین وقت کے ساتھ بدل دئے جائیں تو عقیدے اور قانون دونوں کی حیثیت بدل جاتی ہے۔

خالص تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے شرعی قانون اصولاً برابر نافذ رہے مگر عملاً حاکموں نے دنیاوی معاملات میں جو جی چاہا کیا۔ مثلاً بادشاہوں نے آمدنی کے طریقے نکالے، سزائیں دیں اور بہت سے ایسے کام کئے جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی اور جن کی جانچ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف قانون ہی نہیں بلکہ اسلامی عقائد اور اخلاق کے بھی خلاف تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ظاہر ہے شریعت کا نفاذ حکومت کے ذمے نہیں رہا اور صرف چند معاملات میں، جو انفرادی حقوق یا پرسنل لا کے ضمن میں آتے ہیں عدالتوں نے اس کی رعایت رکھی کہ پرانا قانون رسم سمجھ کر برتا جائے۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انفرادی

قوق یعنی پرسنل لا کے ایک اہم شعبے میں، جس کا تعلق وراثت سے ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی رسمیں شرعی
نون کے خلاف پڑتی ہیں اور انگریزوں نے نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے اصرار کیا کہ عدالت شریعت کے بجائے
م کے مطابق فیصلے کرے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال پنجاب اور یوپی کے زمینداروں کی رسم تھی کہ لڑکی کو
ئداد ورثے میں نہ ملے اور لڑکوں میں بھی سب سے بڑے لڑکے کو وراثت اور باقی کو صرف گذارے کا حق دار
ا جائے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت نے جو قانون بنائے اور خاص طور سے قانون تعزیرات
ں اسلامی شریعت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔

یہ خیال غلط ہے کہ حکومت کے قانون اپنی جگہ اور شریعت کے قانون اپنی جگہ نافذ سمجھے جا سکتے
ں۔ شریعت کے قانون زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہیں اور حکومت کے قانون بھی
محالہ زندگی اور معاملات کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے عبادات کے
یدان میں دخل اندازی نہیں کی، لیکن یہ مسئلہ کافی شدید اختلافات اور فسادات کے بعد طے
ا کہ اگر مسجد سڑک میں آ جائے تو سڑک کو الگ ہٹا کر بنانا چاہیئے۔ یا مسجد یا اس کے کسی حصے کو
دینا چاہیئے۔ مسلمان اس خوش فہمی میں رہے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور شریعت کے قانون میں
وئی تبدیلی نہیں کی جا رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ حکومت کی تحریک سے فتویٰ حاصل کیا جا سکتا
ا کہ ہندوستان دار الامن ہے اور معاملات سے متعلق شریعت کا کوئی قانون نہیں تھا جسے بنانے
قت علماء سے مشورہ کیا گیا ہو یا شرعی قانون سامنے رکھا گیا ہو۔ انگریزی حکومت کی مصلحت
ندیشی تھی کہ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ شرعی قانون میں تبدیلی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی
ی اصلاح کی کوشش نہیں کی جس کی مخالفت مسلمانوں کا کوئی طبقہ دین اور شریعت کا حوالہ دے کر
سکتا۔

جس کسی منظم ریاست میں قانون بنتے ہیں تو یہ واضح اور مسلم ہوتا ہے کہ قانون بنانے یا بنے ہوئے
نون میں تبدیلی کرنے کا اختیار کس کو ہے۔ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں
جس کے مستند ہونے کے بارے میں مسلمان متفق ہوں۔ اجتہاد اور اجماع بحث کی خاطر تو تبدیلی کرنے
ذریعے مانے جا سکتے ہیں، لیکن نہ تو اجتہاد کرنے کا حق کسی کو واضح طور پر دیا گیا ہے اور نہ اس کی

حدود مقرر کی گئی ہیں۔ اجماع کی صورت کیا ہو سکتی ہے اس کا طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ علماء کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ رسماً یا احتراماً مان لیا جائے تب بھی یہ معاملہ رسم اور احترام کا ہوگا، واضح قانون کا نہ ہوگا ویسے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کل صحیح معنی میں عالم اسی کو مانا جا سکتا ہے جو صرف دینی علوم میں ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم اور خاص طور پر اجتماعیات اور علم قانون میں ملکہ رکھتا ہو۔ یہ شرط ان لوگوں کو جمع کرکے پوری نہیں کی جا سکتی جن میں سے کچھ دینی علوم سے اور کچھ دنیاوی علوم سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ دودھ، چاول اور شکر کو ملا کر کھیر نہیں بنتی، اس کے لئے ہانڈی اور آگ بھی چاہیئے اور وہ مدت کہ جو ان تینوں اجزاء کو ملا کر ایک مزہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے

اس وقت اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل ثابت ہے کہ شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا حکومت کو حق نہیں ہے، اگرچہ مستشرقین کی کانگریس میں جو سیمینار ہوا تھا اس میں چھاگلا صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ سیکولر ریاست کی پارلیمنٹ انصاف اور عام مفاد کی خاطر ہر قسم کا قانون بنانے کی مجاز ہے، صرف عقائد کے معاملے میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس رائے کو ثابت کرنے کے لئے چھاگلا صاحب نے دلیل یہ دی تھی کہ حکومت معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق قوانین بنانے کی مجاز ہے اور اس سے بہر حال انفرادی حقوق پر اثر پڑتا ہے اور جب کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق ان انفرادی حقوق سے ہو جو شریعت کے مطابق دیئے گئے ہیں، عدالت میں پیش ہوتا ہے تو جج کا فیصلہ لامحالہ شرعی قانون میں اضافہ یا ترمیم کرتا ہے (شاید اسی خیال سے کہ قاضی کا فیصلہ اضافہ یا ترمیم نہ کر سکے شریعت میں کسی معاملہ کا فیصلہ اسی قسم کے دوسرے معاملات کے لئے سند نہیں مانا گیا ہے)۔ اسی سیمینار میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے یہ رائے دی کہ علماء کا قانونی معاملات میں "اولوالامر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ وہ وزارت قانون کے اشتراکِ عمل سے اس پر غور کریں کہ کن خاص معاملات میں شرعی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اسی سیمینار میں ترکی کے سفیر، سیف اللہ لسین اور مصر کے سفیر، احمد حسن الفقیہ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی کرنے کے بجائے چاروں مذاہب کے اصولوں کو

سامنے رکھا جائے تو بہت سی ضروری اصلاحیں کی جاسکتی ہیں۔ مصر میں چار وں مذاہب کے علاوہ شیعی مذہب کے اصول بھی سامنے رکھے گئے اور اسی طرح یہ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے دائرے سے نکلے بغیر ایسے اصولوں کو قانون کی شکل دی جاسکتی ہے جو انفرادی حقوق کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کر دیں جتنا کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔

ضروری اصلاحوں سے کیا مطلب ہے یہ چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں بیوہ کی شادی کا رواج بند ہوگیا تھا اور اتنے عرصے تک بند رہا تھا کہ اس کی ممانعت کو ایک شرعی قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سید احمد شہیدؒ نے ضروری سمجھا کہ بیوہ کو اس کا حق دیا جائے اور اس حق کو دلانے کے لئے خود ایک بیوہ سے شادی کی اور اپنے ان ساتھیوں کو جن کی شادی نہیں ہوئی تھی ہدایت کی کہ بیوہ سے شادی کریں۔ اس اصلاح کی ضرورت ایک اعلیٰ شخصیت کے ضمیر نے محسوس کی اور اس کے خلاف یہ کہنا کہ بیوہ عورتیں خود نہیں چاہتی ہیں کہ دوبارہ نکاح کریں یا یہ کہنا کہ بیوہ عورتوں کی نمایاں تعداد نے اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے بالکل غلط ہے۔ دوسری قسم کی مثالیں وہ ہیں جو احمد حسن الفقیہہ صاحب، سفیر مصر نے اپنی تقریر میں پیش کیں۔ مصر میں عدت کا زمانہ تین سال تھا، شوہر مفقود الخبر ہو جاتا تو بیوی انتظار میں عمر بھر بیٹھی رہتی۔ شوہر کے لئے طلاق دینا اتنا آسان تھا اور خاص حالات کی وجہ سے جو شوہر قانونی رعایت سے فائدہ اٹھا رہے تھے ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیوی کے حق کا تحفظ نہیں ہوسکتا تھا۔ عورتوں میں تعلیم پھیلی تو یہ لازمی بات تھی کہ رائج قانون کے خلاف احتجاج کریں، اس کے علاوہ مسلمانوں اور ان کے طریق زندگی پر اعتراض کرنے والے بہت تھے اور اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ترکی میں ۱۹۱۱ء سے جو لڑائیاں شروع ہوئیں تو انھوں نے مردوں کی آبادی اتنی کم کردی کہ اگر عورتیں پردے میں بیٹھی رہتیں یا انھیں وراثت کا اور اپنی جائداد کا خود انتظام کرنے کا حق نہ ملتا تو ترک بالکل تباہ ہوجاتے۔ ایسی صورتوں میں یہ بحث چھیڑنا لازمی ہے کہ جس تقاضے یا قانون کی پیروی یہ سمجھ کر کی جارہی ہے کہ وہ شریعت کا حکم ہے وہ واقعی حکم ہے یا نہیں اور اگر ان سوالات کا جو کئے جارہے ہیں کوئی معقول جواب نہ دیا جائے تو پھر افراد تنگ ہوکر شریعت

۔ کے دائرے سے بالکل ہی نکل جانے کا فیصلہ کرنے لگتے ہیں جیسے اس صدی کے شروع میں پنجاب کی عورتوں نے ان حقوق سے محروم رکھے جانے پر جو اسلام نے ان کو دئے تھے، عیسائی مذہب قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ ایسے لوگ بہرحال کم ہوں گے مسئلے کو ٹالنا ہے اور اس سے ایسا نقصان ہو سکتا ہے کہ جو اصولی اعتبار سے بہت اہم ہو۔

اس سیمینار میں سید حسین نصر، ایک ایرانی فاضل کی تقریر بہت فکر انگیز تھی۔ انھوں نے بہت اصرار سے کہا کہ شریعت کو دین اور معاملات دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے انسان کو جسم اور روح دو حصوں میں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی شریعت جسم اور روح کے اتحاد و اتصال کا نمونہ اور احکام الٰہی کا مجسمہ ہے، ہم جن مادی حقائق کو سامنے رکھ کر شریعت کو جانچتے ہیں وہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے، ایسا رخ جو بدلتا رہتا ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ قانون کو وقت کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہیئے کیونکہ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کس کے ساتھ چلتا ہے اور اس کو چلانے والا کون ہے۔ دراصل شریعت کو عقائد اور معاملات دو حصوں میں کرنا عیسائیوں کی تقلید میں شروع کیا گیا۔ عیسائی مذہب میں کوئی شریعت نہیں ہے، یہ پوری پوری رومی قانون سے ماخوذ ہے، اس لئے عیسائیوں میں قانون کی حیثیت ضمنی اور اتفاقی ہے اور دراصل اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب اسی بات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ جیسے عیسائی ملکوں نے اپنا قانون بدلا ہے ویسے ہی وہ بھی اپنی شریعت کو بدلیں۔ یہ مطالبہ یورپ اور امریکہ کی نقل کے خاطر کیا جاتا ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تعدد ازدواج کو برا سمجھیں اس لئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے اور ہم میں احساس کمتری اس درجہ پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے بلا تامل مان لیتے ہیں۔ عیسائی مذہب کے طریقہ کار اور یورپ و امریکہ کے رواج کی نقل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اخلاقی حاکم بھی بن جائے گی اور اس کے مقابلے میں شریعت کیا قرآن کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ لیکن یہ سب کہنے کے بعد سید حسین نصر نے یہ بھی کہا کہ ایران میں علماء کے مشورہ سے اور نپولین کے مجموعہ قانون کو سامنے رکھ کر احکام مدنیہ مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی ایران میں بھی اسی طرح انفرادی حقوق میں

تبدیلیاں کی گئی ہیں جیسے ترکی اور مصر میں اور طریق کار بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں۔
اب اگر ترکی میں یہ مان لیا گیا ہے کہ قومی اسمبلی کا فیصلہ اجماع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس طرح
قومی حکومت کو قانون بنانے کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے تو اس سے حسین نصر صاحب کو بھی
اختلاف نہیں کرنا چاہیئے۔

دراصل جو حقیقت ہے اسے نظر میں رکھیں تو بحث بہت مختصر کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ہندوستان
میں شریعت کو نافذ کرنا تو درکنار شرعی مسائل کے متعلق رائے دینے کا اختیار بھی کسی شخص یا جماعت
کو نہیں ہے اور فتویٰ حاصل کرنے کا پرانا طریقہ معاملوں کو طے کرنے کے بجائے خود علماء میں فساد پیدا
کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی ایسی دینی تنظیم بھی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ افراد پر اثر
ڈالا جا سکے اور صحیح اور غلط طریقۂ کار کے بارے میں فیصلے کئے جا سکیں۔ مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت
تو ان کی مرضی سے قائم ہے اور اگرچہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں استقلال اسی وجہ سے
ہے، لیکن اس صورت حال کے سبب سے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو اہل فکر ہوں وہ
نئے سماجی رجحانات کا اندازہ کرتے رہیں اور جن مسائل کی اصولی حیثیت ہو ان میں افراد کی
رہنمائی کی صورتیں نکالتے رہیں۔ عیسائی دنیا میں ہر جگہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے
درمیان مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ لڑکی کسی رومن کیتھولک لڑکے سے شادی کرے تو وہ فرقے
سے خارج سمجھی جا سکتی ہے اور اگر رومن کیتھولک لڑکی پروٹسٹنٹ سے شادی کرے تو رومن کیتھولک
کلیسا کی طرف سے اس کو اجازت مل سکتی ہے اس شرط کے ساتھ کہ اولاد رومن کیتھولک ہو گی، اس
طرح لڑکی کلیسا کے اثر میں رہتی ہے اور رومن کیتھولک جماعت میں اگر ایک فرد کی کمی ہو جاتی ہے
تو نئے افراد کے اضافے کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے اور ایک کارروائی جو فی نفسہ مناسب نہیں
سمجھی گئی ہے غیر قانونی نہیں ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگوں میں
شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، ہم چاہیں تو اس بات کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں کہ
مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادی کرتی ہیں، چاہیں تو اس کا کوئی انتظام کر سکتے ہیں کہ
قانون کی خلاف ورزی سے جماعت کو کم سے کم نقصان ہو۔ اگر ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو ایسا